

www.pdfbooksfree.blogspot.com

سالمی کنول



ایک

ہم بھرے شہروں میں بھی تنہا ہیں جانے کس لئے
لوگ دیرانوں میں کھیتے ہیں پیدا آشنا
(احمد فراز)

اس نے قدرے بے دلی سے کتاب بند کر دی۔ دُور سامنے سڑک پر یکایک
بہت زیادہ چل پھل ہو گئی تھی۔ دونوں ہتھیلیوں پر ٹھوڑی ٹکا کر وہ ادھر ہی دیکھنے
لگی۔

دوپہر ہو چکی تھی۔ دو بجے تھے۔ یا پھر اڑھائی بجے ہوں گے۔ اسے وقت کا
اچھی طرح اندازہ نہ تھا۔

سکولوں، کالجنوں اور دفاتر میں جھپٹی کا یہی وقت تھا شاید۔ تبھی سڑک پر
آمدورفت بہت بڑھ گئی تھی۔

لوگ میکانیکی انداز میں ایک ہی منزل کو بڑھ رہے تھے۔ اپنے اپنے
گھروں کو۔ جیسے شام ڈھلے پرندے اپنے اپنے آشیانوں میں بسیرا لینے کے لیے!
سکولوں کے ننھے ننھے بچے یوں بھاگ رہے تھے گویا ابھی ابھی کسی قید خانے

سے رہا ہو کر آئے ہیں۔ معصوم بچے۔ خدا کی خوبصورت ترین مخلوق۔!!
اور وہ بڑے انہماک سے دیکھے جا رہی تھی۔ اور جانے کیا سوچے جا رہی
تھی۔

پیدل چلنے والوں کے علاوہ سائیکلوں، تانگوں، کاروں اور بسوں کا ایک
ماتا بندھ رہا تھا۔ اور وہ دم سارھے اس رواں دواں زندگی کو دیکھ رہی تھی۔
ہر طرف حرکت تھی۔ حرکت۔ جو زندگی کا دوسرا نام ہے۔ اور وہ۔ وہ
سوچ رہی تھی۔

چھ سال کی مسلسل بے کاری نے اُسے کتنا سست اور کاہل بنا دیا تھا۔
اس میں تو حرکت رہی ہی نہیں تھی۔ زندگی سے خالی تھی وہ تو۔!!
بی اے کرنے کے بعد اس نے کیسے کیسے آبا کو منانے کی کوشش نہیں کی
کہ وہ اسے کوئی ملازمت کر لینے کی اجازت دے دیتے۔
یوں۔ اس کی زندگی بھی رواں دواں تو رہتی۔ وہ ایک رنگ آؤد پرزہ تو
نہ بن کر رہ جاتی۔

مگر۔ اپنی تمام تر روشن خیالی کے باوجود آبانے اسے ملازمت کرنے کی
اجازت نہ دی۔ کہیں بھی نہیں۔ نہ کسی دفتر میں اور نہ کسی سکول میں یا ادارے میں
صرف اس لیے۔ کہ ان کی زندگی میں ان کی پھول سی سچی نوکری کیوں کرتی
ان کی اپنی معقول آمدن تھی۔ اتنی۔ کہ ان کی دو بیٹیوں والا گھراگھی طرح
چل رہا تھا۔ ہر قسم کی آسائش موجود تھی۔ پھر وہ نوکری کے لیے درد کیوں بھٹکتی
پھرتی۔!!

البتہ۔ اگر وہ ایم اے کرنے کی خواہش کرتی تو اس کی خواہش ان کے
سر آنکھوں پر۔ بلکہ۔

یہ تو ان کا اپنا بھی شوق تھا۔ بیٹا کوئی تھا نہیں۔ اعلیٰ تعلیم دلوانے کا بیٹے
والا شوق اب انہوں نے دونوں بیٹیوں پر ہی پورا کرنا تھا۔

اور بیٹیوں میں سے بھی خصوصاً اس کے ساتھ تو ان کی بڑی امیدیں وابستہ
تھیں۔ کہ وہ شروع سے ہی بے حد ذہین، بے حد ذمہ دار اور بڑی خوش دلی
بچی تھی۔

عجیب سی نکھری سُٹھری اس کی عادات تھیں۔ عجیب سا میٹھا میٹھا اس کا
مزاج تھا۔ کہ اس سے ملنے والے اکثر چونک اٹھتے تھے۔

مگر۔ اس نے ایم اے کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ذہین اتنی تھی مطالعہ
اتنا وسیع تھا۔ کہ بغیر یونیورسٹی میں داخلہ لیے۔ جماعت میں جا کر بغیر یکپہ سنے ہی
امتحان دے دیتی تو انگریزی اور اردو کا ایم اے تو آسانی اور اچھے نمروں پر
کر سکتی تھی۔

لیکن اس کی دانست میں تو ان بی اے اور ایم اے کی ڈگریوں میں کچھ نہ
پڑا تھا۔ چند کتابوں کو رٹ لیا اور کاغذ کے ان بے معنی سے ٹکڑوں کو جنہیں دنیا
ڈگریاں کہتی ہے، اپنا اثاثہ حیات سمجھ لیا۔ زندگی کو بالیا جیسے۔!!
علم کہاں ہے۔

وہ علم جو ذہن کو جلا بخشتا ہے اور روح کو تازگی۔ جو انسان کو خدا کے قریب
لاتا ہے۔

اسے تو اسی علم کی تلاش تھی۔ جو رُوح کی گہرائیوں تک جا پہنچتا ہے۔ اور انسان کو ایک انوکھے، ایک نرے رنگ میں دکھ دیتا ہے۔ پھر اسے دنیا کی نہ دنیا والوں کی۔ کسی کی بھی پرواہ نہیں رہتی۔

”کوئی بی بی۔ آپ کھانا کب کھائیں گی؟“

کینز کی آواز سے چونکتے ہوئے اس نے اپنی گم شدگی کو پالیا۔

”فری پونیورسٹی سے آگئی ہے۔؟“

کوئل نے تھیلیوں پر سے مٹوڑی تو اٹھالی تھی مگر مڑ کر پیچھے دیکھے بغیر ہی پوچھنے لگی۔

”جی ابھی تو نہیں آئیں۔ بس آتی ہی ہوں گی۔“

”اور آتی؟“

”بیگم صاحبہ۔؟“ کینز کے لبے میں تھیر تھا۔

”وہ آپ کے سامنے ہی صبح صاحب کے ساتھ آپ کے بڑے ماموں کے ہاں چلی گئی تھیں۔ بہت دیر سے آئیں گی۔ شاید رات کو۔“

”اوہ۔ ہاں یاد آیا۔ مجھے بتا کر تو گئی تھیں۔ پاگل ہوں میں بھی۔!“

بڑے پیار سے انداز میں اپنا سر جھٹک کر وہ اپنے آپ پر ہی ہنسی۔ لمحہ بھر بعد نگاہ اٹھائی۔ کینز اس کے جواب کی منتظر کھڑی تھی۔

”اچھا تو پھر ابھی فری کا انتظار کر لو۔ وہ آجائے گی تو اکٹھے ہی کھالیں گی۔ اب میں کیا اکیلی بیٹھ کر کھاتی اچھی لگوں گی۔! اکیلی۔!“

جانے ذہن میں کون سی سوچ در آئی تھی۔ وہ پھر مسکرائی۔ مڑ کر دیکھا۔

کینز ابھی تک کھڑی تھی۔ پتہ نہیں وہ جا کیوں نہیں رہی تھی۔ اور۔ تنہا بیٹھ کر سوچوں میں کھویا رہنا آج کل اس کا دل پسند مشغلہ تھا۔

اسے وہاں سے جانے کے لیے صاف کہہ بھی نہ سکی۔ کہ وہ کسی کا بھی دل نہیں دکھا سکتی تھی۔ پھر بات بنائی۔

”کہا ہے ناکہ فری کا انتظار کر رہی ہو۔ ورنہ تمہیں دوبارہ تردد کرنا پڑے گا۔“

”تردد کیسا کوئل بی بی۔ میں تو آپ کی کینز ہوں۔“

”آپ کی کینز ہوں۔“

وہ زور سے ہنسی۔

”اچھا فقرہ ہے۔“

اس ملازمہ کا نام کینز ہی تھا۔ کوئل نے اسے داد دی۔ پھر مسکرائی۔

”تم اگر پڑھ لکھ جانتیں تو۔۔۔“

”اوہ۔! اس کا فقرہ پورا ہونے سے پہلے ہی کینز نے ٹھنڈی آہ بھری۔“

”اپنے ایسے نصیب کہاں بی بی۔!“

”اتنا آزرہ ہونے کی ضرورت نہیں کینز۔!“

کوئل نے کینز کا یکدم افسردہ ہو جانے والا چہرہ دیکھ کر جلدی سے بات بدلی۔

”کتنی لوگ بہت سارا پڑھ لکھ کر بھی جاہل ہی رہتے ہیں۔ تم ان لوگوں سے

بہت بہتر ہو۔“

اور اس سے پہلے کہ کینز پھر ٹھنڈی آہ بھرتی۔ کہ اسے بات بے بات وجہ

بلادہ ٹھنڈی آہیں بھرنے کی بہت عادت تھی۔ کوئل کی نگاہ ادھر سڑک کی جانب

اٹھ گئی۔

فری آرہی تھی۔ گھر میں اچھی خاصی یہ بڑی مزدگارڑی موجود تھی مگر اسے یونیورسٹی جانے آنے کے لیے صرف سائیکل کی سواری پسند تھی۔

کچھ اس لیے کہ اس کی پرورش زیادہ تر لڑکوں کے انداز میں ہوتی تھی۔ لڑکوں والے سکول اور کالج میں اس نے تعلیم پائی تھی۔ لڑکوں ہی کی طرح اٹھلیکھس اور دوسرے کھیلوں میں حصہ لیتی تھی۔

کوئی کھیل لڑکیوں والا نہیں کھیلا۔ سائیکل ریس میں تو اس نے لڑکوں کو بھی ہمیشہ شکست دی۔

اس کے علاوہ سائیکل کی سواری آزاد سواری تھی۔ صرف اس کی اپنی ملکیت۔ کسی اور کی کوئی حصہ داری یا پابندی نہ تھی۔

اور گاڑی گھر کے سب افراد کے لیے تھی۔ کبھی وہ آبا کو دفتر لے جاتی تو اسے انتظار کرنا پڑتا اور کبھی اتنی یا باجی کو کہیں آنا جانا ہوتا تو اسے خواہ مخواہ ہی یونیورسٹی کے لان میں بیٹھ کر نہ جی چاہنے کے باوجود لمبی لمبی بحثیں کرنا پڑتیں۔

گاڑی کے انتظار میں یوں کبھی یونیورسٹی سے دیر ہو جاتی اور کبھی واپس گھر جانے کے لیے سوکھنا پڑتا۔

اور وہ۔ کوئی پابندی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

اور۔ اس کی سائیکل۔ اس کی ہم سفر۔ ہر وقت ہر لمحہ ہمراہی کو تیار۔ جب ضرورت پڑی۔ اسے پکڑا۔ شوں کر کے ادھر چلے گئے۔ شوں کر کے ادھر۔

سائیکل ریس جیت جیت کر وہ سائیکل کو کار سے زیادہ تیز چلانے میں

تاک ہو چکی تھی۔ پھر وہ اپنی آزادی پر کوئی بھی پابندی کیوں مسلط کرتی۔ اور یوں ہمیشہ تیز سائیکل چلانے کی شوقین اس وقت بہت آہستہ آہستہ سائیکل کے ساتھ ساتھ پیدل ہی چلی آ رہی تھی۔

”لو۔ تمہاری فری بی بی بھی آگئی۔ اب تم کھانا لگا دو۔“

کومل کی نگاہیں اسی پر ٹکی تھیں اور بات کینز سے کیے جا رہی تھی۔

”اور اں خیال رکھنا۔ اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔ کھانا اسی حساب

سے لگانا۔ ساتھ جلدی سے آٹلیٹ وغیرہ بنالو۔“

فری کے ساتھ دوسری سائیکل لیے اسی کی سی سست رفتار سے ایک

نوجوان باتیں کرتا چلا آ رہا تھا۔

وہ دونوں عدد دروازے سے ابھی دو تین گز کے فاصلے پر ہی تھے کہ فری

نے ادھر بالکنی کی طرف دیکھا۔ شاید پہلے ہی سے وہاں کومل کی موجودگی کی متوقع تھی۔

اسے دیکھتے ہی ہاتھ ہلا کر کچھ اشارے کرنے لگی۔

”اتنی بڑی ہو گئی ہے مگر ابھی تک بچوں والی حرکات اس نے چھوڑی نہیں۔“

کومل نے بڑے پیار سے سوچا۔

”چلتی سرکل پر سے ہی اشارے کرنے لگی ہے۔ کوئی اور دیکھے تو کیا سمجھے۔“

اسے فری کی بے وقوفی پر بے حد ہنسی آئی۔ اور۔ یونہی اشارے کرتے

کرتے اور باتیں کرتے کرتے وہ نوجوان کے ساتھ کومل کے چھانک کے اندر

داخل ہو گئی۔

کینز کھانا لگانے جا چکی تھی۔ کول کاہلی سے اٹھی۔ آج کل جانے کیوں طبیعت پر اتنی سستی سی چھائی رہتی تھی۔

اسی کاہل انداز میں ہوئے ہوئے قدم رکھتے دروازے تک جا پہنچی کفری جب گھرایا کرتی تھی تو کھانے میں ایک منٹ کی بھی دیر اس سے برداشت نہیں ہو پاتی تھی۔

جب تک گھر سے باہر رہتی تھی اسے بھوک کا احساس نہیں ہوتا تھا جانے کیا وجہ تھی؟ جونہی گھر میں قدم رکھا بھوک نے اس پر حملہ کر دیا۔ پھر وہ ایک منٹ بھی صبر نہیں کر سکتی تھی۔

اپنی اس کمزوری کا وہ خود ہی مذاق اڑا کر اعتراف کیا کرتی تھی۔ اسی لیے کول نے سوچا کہ ذرا سی بھی دیر کیسے بنا۔ یا اس کے شور مچانے سے پہلے ہی وہ کھانے والے کمرے میں پہنچ جاتی تو بہتر تھا۔

مگر جانے فریج کس رفتار سے اوپر آتی تھی۔ شاید سائیکل ریس والی رفتار سے۔ کول اپنے کمرے کے دروازے تک ہی گئی تھی کہ وہ پہنچ گئی۔

”تسلیمات باجی۔!“

سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ وہ دُور سے ہی پکاری۔ پھر دھم کر کے ایک ہی جست میں اس کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

”دیکھیے باجی! آج میں کس کو ساتھ لاتی ہوں۔ او۔ آجاؤ نا۔“

پچھے مڑ کر وہ ساتھ آنے والے کو کہہ رہی تھی۔

کول نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا۔ البتہ بڑی دلچسپی سے اس آنے والے

کو دیکھنے لگی۔

سُرخ جھکاتے، نگاہیں جھکاتے، وہ عجب سہمے سہمے سے انداز میں اندر داخل ہوا۔

”یہ ہیں میری باجی۔ کول۔ اور باجی! یہ عدیل ہے، میرا کلاس فیلو۔ تعارف کرانے کا فرض مجھے میں ادا کرتے ہوئے فریج نے آگے بڑھ کر بڑی بے پرواہی سے کول کی مسہری پر کتابیں پھینک دیں۔ اور پھر خود بھی وہیں بیٹھ کر ٹوٹا تارنے لگی۔

وہ کمرے کے وسط میں کھڑا حیران حیران نگاہوں سے کبھی کول کو اور کبھی فریج کو دیکھ رہا تھا۔ مگر وہ اس کی طرف سے بے خبر اسی طرح اپنے پاؤں پر جھکی ہوئی تھی۔

”تشریف رکھیے!“

کول نے بڑی تمکیدی نگاہ سے فری کی اس لا پرواہی کو دیکھنے کے بعد جلدی سے بڑھ کر اسے کرسی پیش کی۔

”شکریہ!“

انتہائی ممنون نگاہی سے کول کو دیکھنے کے بعد بڑے تکلف سے وہ ایک کونے پر ہی ٹپک گیا۔

”دیکھو عدیل! فریج نے سراٹھایا۔“

وہ بڑی متعجب سی نگاہوں سے کول کو سر سے پاؤں تک دیکھ رہا تھا۔ اور وہ۔ ان دونوں کی طرف پشت کیے جلدی جلدی پرلے دیوان پر پھیلیں۔

بکھریں کچھ چیزیں سمیٹ رہی تھی۔

”یہی میری باجی ہیں۔ حیران کیوں ہو رہے ہو۔“

فریجہ نے زور سے قہقہہ لگایا۔

”مگر۔ مگر۔ وہ کچھ کہتے کہتے چپ سا ہو گیا۔“

”ہاں ہاں۔ کہہ دو۔ تم بھی کہہ دو۔ کہ میری باجی لگتی نہیں۔ سبھی یہی کہتے ہیں“ فریجہ پھر ہنسی۔

”مجھ سے پورے چھ سال بڑی ہیں۔ مگر ان کی نزاکت نے تو میری مارکیٹ ویلیو بالکل خراب کر چھوڑی ہے۔ ہر کوئی انہیں مجھ سے چھوٹا سمجھ لیتا ہے۔“ وہ شرارت سے مصنوعی انداز میں لبوری۔

”اسی لیے میرا عام سامان ہے اور ان کا چاقا قاسم نے پیار دلار سے مدیکر ہٹا کر کوئل رکھ دیا۔ ان کی نزاکت کی مناسبت سے۔ اور حالانکہ یہ نام مجھے پسند تھا۔ کیسی دھاندلی ہے۔؟ کیسی نا انصافی ہے؟“

فریجہ بڑبڑاتی رہی اور کوئل اپنا کام کرتی رہی اور ہولے ہولے مسکراتی رہی۔ عدیل کی نگاہیں ہنوز اسی پر جمی تھیں۔

”تم باجی کو دیکھ کر یقیناً بہت مایوس ہوتے ہو گے۔“

فریجہ نے عدیل کو مخاطب کیا۔ اب وہ بالکل سنجیدہ تھی۔

”مگر یہ ظاہر ہیں ایسی سیدھی سادی اور کم گوسی لگتی ہیں۔ اندر سے۔ بس کچھ مت پوچھو۔ ایک نظر دیکھنے سے ان کے جوہر سامنے نہیں آسکتے۔ ان کی خوبیاں تو آہستہ آہستہ تم پر کھلیں گی۔“

پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اچھا باجی! میں منہ ہاتھ دھو آؤں۔ بڑی بھوک لگ رہی ہے۔“

آخر اس نے اپنا نعرہ بلند کر دیا۔

”کینز کو ذرا کیسے کہ آج کھانا یہیں لے آئے۔ مجھ سے کھانے والے کرے

تک نہیں جایا جاتا۔“

اور وہ اپنی بات کا جواب لیے سنے بنا کرے سے باہر نکل گئی۔

”پاگل لڑکی۔“

کوئل نے بڑے پیار سے انداز میں اپنا سر جھٹکا۔

عجیب ہی تو تھی وہ۔

کیسی عجیب عجیب باتیں کرتی رہتی تھی۔

اس کے خیال میں اس کی باجی جیسی کوئی اوڑ لڑکی دنیا میں نہیں ہو سکتی

تھی۔

پیاری سی، نازک سی، اپنے نام جیسی کوئل سی۔!

اور۔ صورت کے علاوہ سیرت میں بھی وہ لاثانی تھی۔ بڑی زندہ دل اور

خوش مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ باوقار بھی تھی۔

کبھی کسی پر غصہ نہیں آتا تھا۔ کبھی کسی کا برا نہیں چاہا تھا۔ اپنی ذات کو

نقصان پہنچا کر بھی دوسروں کے کام آتی تھی۔

عجب ٹھنڈی میٹھی سی لڑکی تھی۔ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق تھی شاید جسے

اللہ میاں نے اسے بطور باجی تحفہ و دلچست کر دیا تھا۔ کہ۔ اسے اس کے ساتھ

بے حد بے حد محبت تھی۔ اتنی۔ کہ کسی بڑی بہن سے چھوٹی کو اتنی نہ ہوگی۔
اور خود کو مل کے دل میں بھی اپنے سے زیادہ اس کا خیال اور پرواہ تھی۔
اسی کے متعلق سوچتے ہوئے اس نے نگاہ اٹھائی۔ وہ لمبا ترنکا، بے
خوبصورت آنکھوں والا شرمیلا سالار کا سر جھکا سہ چپ چاپ بیٹھا تھا۔
اب اسے ترس آگیا۔ کتنی ہی دیر سے کمرے میں سکوت طاری تھا۔
یقیناً وہ بور ہو رہا ہوگا۔ آخر کو مل نے ہی پہل کی۔

”آپ فری کے کلاس فیلو ہیں؟“
اور اس کو اپنے سوال پر خود ہی ہنسی آگئی۔
”فری۔؟“ اس نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔
”فریج کو گھر میں ہم سب فری کہتے ہیں۔“

اس نے جلدی سے اس کی حیرت کا اسے جواب دے دیا۔ حالانکہ اس نے
ابھی کچھ پوچھا بھی نہیں تھا۔
”مگر۔ وہ خود تو سمجھ گئی تھی۔!“
”جی ہاں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔
”اور۔“ وہ محو طر اس کا جھجکا۔

”آپ سے غائبانہ تعارف تو بڑے عرصے سے تھا۔ ملاقات کا شرف آج ہی
حاصل ہوا۔“

وہ یوں مودب انداز میں بات کر رہا تھا جیسے کسی بہت بڑی شخصیت
سے ہم کلام تھا۔ اسی انداز میں وہ بوکھلایا بھی جا رہا تھا۔

”غائبانہ تعارف۔؟ کو مل نے تحیر سے اسے دیکھا۔
”جی ہاں۔ فریج ہیں آپ کی بہت باتیں سنایا کرتی ہے۔ کہ آپ بے حد
ذہین ہیں۔ بڑے بلند ذوق کی مالک ہیں۔ ہزاروں شعر آپ کو منہ زبانی یاد ہیں۔
نثر آپ بہت اچھی لکھتی ہیں۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ ادب کی انسائیکلو پیڈیا
ہیں آپ۔“

وہ بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کر کے بیٹھی ہوئی تھی۔ عدیل کے آخری
الفاظ سننے کے ساتھ ہی ہنسی قہقہہ بن کر اس کے حلق سے پھوٹ پڑی۔
”جی۔ جی کیا ہوا۔؟“

وہ یکدم گڑ بڑا گیا۔ شاید اس نے کوئی غلط فقرہ بول دیا تھا۔!
”معاف کیجیے گا۔۔ میں دراصل۔۔۔“

وہ ہاتھوں کو ایک دوسرے میں دے دے کر سل رہا تھا۔ جانے کیا بات
تھی۔؟

وہ جو بہترین مقرر تھا۔ بڑا باتونی مشہور تھا۔ اس وقت سب کچھ بھولا
جا رہا تھا۔

بڑی مشکل سے جو اس درست کرتے ہوئے جلدی سے اس نے اپنی بات
پوری کر دی۔

”آج ہم دوستوں میں بحث ہو رہی تھی کہ آیا لڑکیاں بھی اٹلیکچرل ہو سکتی
ہیں۔ اور۔“

اب اس کی زبان میں وہ ہکلاہٹ اور انداز میں وہ گھبراہٹ نہیں

تھی۔ بڑی دلیری سے کول کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔
 ”آپ برا نہ مانیے گا۔ مگر میں اس بات کو مان نہیں سکتا کہ عورت سی
 ناقص العقل ہستی بھی انٹیکچرل ہو سکتی ہے؟“
 عدیل کی صاف گوئی پر وہ مسکرا پڑی۔ سرخ ہونٹوں کے درمیان اس کے موتوں
 ایسے سفید و انت بکلی کی طرح چمکے۔ عدیل کی نگاہیں جھک گئیں۔
 ”پھر ہماری بحث سے تنگ آکر فریجہ نے کہا کہ وہ آپ سے ہیں ملا کر ہماری
 غلط فہمی دور کر ڈالے گی۔ آپ سے ملنے کے بعد ہم لڑکے یقیناً اپنا نظریہ بدلنے پر
 مجبور ہو جائیں گے!“

”تو آپ اپنا نظریہ بدلنے آتے ہیں یا مناظرہ کرنے۔؟“
 کول ہنسی۔ اس کے بے تکلف انداز نے عدیل کو بھی قدرے بے تکلف کر دیا۔
 ”جو جی چاہے سمجھ لیجیے!“
 اب وہ بھی مسکرا کر ذرا بے باکی سے بولا۔
 اسی لمحے فریجہ اپنا بھیگا چہرہ تو لیے سے پونچھتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔
 ”با جی! ان کے اچھی طرح کان کھینچنے گا۔ یہ ہم لڑکیوں کو کوروزہن اور
 نجانے کیا کیا سمجھتے ہیں۔“

اس نے شوخی بھرے لہجے میں کہا۔
 ”کان کھینچوں گی۔ ضرور کھینچوں گی۔“
 کول نے مسکرا کر عدیل کی طرف دیکھا۔ ذہین آنکھوں والا یہ لڑکا اسے اچھا
 لگ رہا تھا۔

”فی الحال پہلے کھانے سے فارغ ہوں۔“
 کھانے کے دوران بھی مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ فریجہ بڑی
 شریعتی تھی۔ سارا وقت عدیل کو چھیڑتی رہی۔ مگر وہ کول کی باتوں اور شخصیت
 میں اتنا کھویا کہ اس کی طرف کچھ توجہ ہی نہ دی۔
 کھانے سے فارغ ہوتے ہی فریجہ تاش نکال لائی۔ کول کو تاش کے پسلیوں
 کھیل آتے تھے۔ اور وہ عدیل کو اسی مقصد کے لیے لے کر آئی تھی کہ کول کی
 ذہانت ہر طرح اس سے منوالے۔
 کہ۔ یہ صرف کول اور عدیل کا ہی مقابلہ نہیں تھا بلکہ دو جنسوں کا مقابلہ
 تھا۔

اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے مقابلے میں اس کی جنس ہار جاتے۔
 اور مخالف جنس اسی غرور اور حقارت سے اپنی برتری اور ان کی کمتری کی دہائی
 بیان کرے۔

بہت سارے مختلف قسم کے کھیل کھیلے گئے۔ کول کے مقابلے میں کوئی
 بھی عدیل جیت نہ سکا۔ تالیاں بجا بجا کر فریجہ کے ہاتھ سرخ ہو گئے۔ خوشی کی
 زیادتی سے چہرہ سرخ ہو گیا۔

بہت ساری شکستیں گلے کا اربن گئیں تو عدیل نے تاش پھینک دی۔
 ”یہ کیا منحوس سا کھیل ہے بیٹھے۔ ہم تو با جی آپ سے شعر سننے آتے تھے
 ہم تو کوئی ادبی قسم کی باتیں کرنے آتے تھے آپ سے۔ کہ آپ ادب کی انسائیکلو پیڈیا
 ہیں۔“

فریحہ بے ساختہ قبضہ لگا اٹھی۔ اپنی شکست کو کتنے خوبصورت انداز میں اس نے ٹال دیا تھا۔
وہ ٹھٹھا اڑا کر کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ کوئل نے آنکھ سے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

ایک تو وہ پہلے ہی اتنی ساری بازیاں ہار گیا تھا۔ بے چارہ معصوم سالز کا۔ پھر اوپر سے اس کا مذاق اڑا کر مزید شرمندہ کرنا جائز تو نہ تھا۔ کچھ بھی تھا۔ دل میں کیا لے کر آیا تھا؟ مگر ان کا مہمان تو تھا! اور میزبانی کے یہ فرائض تو نہ تھے!!

باچی کی آنکھ کے اشارے کو فری بہت جلد سمجھ جایا کرتی تھی۔
”ہاں بھئی، اب تماش ختم“
وہ یک دم سنجیدہ ہو گئی۔

”میں بھی بور ہو رہی ہوں“
”باچی۔ اُعدیل نے بڑے ادب سے اسے مخاطب کیا۔ ”ترنم سے کوئی غزل سنائیے“

”ایک ہی نہیں۔ بہت ساری۔ بہت ساری“

فریحہ پر زور انداز میں بولی۔

اب بھی دل کے اندر وہی مقابلے کا جذبہ کار فرما تھا۔ کیوں بھلا لڑنے کے خود کو عقل مند، با ذوق اور سنجانے کیا کیا سمجھتے ہیں۔ اور بے چاری لڑکیوں کو ناقص العقل۔ ”زیادتی ہے نا ان کی!“

”ہاں، سنائیے نا“

اس نے پھر مصومیت سے اصرار کیا۔

کوئل نے فری کے علاوہ کبھی کسی اور کے سامنے کچھ گایا نہیں تھا۔ اور اب۔ دونوں ہی اصرار کیے جا رہے تھے۔ فری تو اس کی اپنی بہن تھی۔

مگر عدیل۔! چند لمحے جھجکی۔ قدرے گھبرائی۔ پھر۔
عدیل فری کا کلاس فیلو تھا۔ فری اس سے تقریباً پانچ چھ سال چھوٹی تھی۔ اور یقیناً عدیل بھی اس سے کافی چھوٹا تھا۔ اتنی اپنائیت اور اتنی مصومیت سے وہ فرمائش کر رہا تھا۔

تب اس وقت۔ کسی شرط یا مقابلے کا جذبہ اس کے پیش نظر نہ تھا۔ صرف دو معصوم سے بچوں کی فرمائش کا خیال کرتے ہوئے اس نے ہلکے ہلکے ترنم کے ساتھ غالب کی ایک غزل چھیڑ دی۔

جب کوئی صحیح ذوق اور خوبصورت انداز میں وار دینے والا سامنے موجود ہو تو خود اعتمادی بڑھ جاتی ہے۔ اس کا لب و لہجہ۔ اس کا ترنم اور بھی نکھر آیا۔ بہت ساری غزلیں سنانے کے بعد میر، غالب اور داغ سے لے کر چوشت فیض، قاسمی اور فراز تک کے اس نے سینکڑوں منتخب شعر سنا ڈالے۔

سبھی ڈوبے ہوئے تھے۔ سنانے والی بھی اور سننے والے بھی۔
آخر میں تھک کر کوئل نے سر صوفے کی پشت کے ساتھ ٹیک کر آنکھیں موند لیں۔

سحر ٹوٹا تو فریحہ نے عدیل کو مخاطب کیا۔

”کیوں عدیل! اب بھی تم عورتوں کو فنونِ لطیفہ سمجھنے کا اہل مانتے ہو یا نہیں؟“
 پھر وہ بڑے انداز سے سکرائی۔
 ”ابھی تو تم نے باجی کے اپنے شعر نہیں سنے۔ مجھے تو وہ سب سے زیادہ
 پسند ہیں۔ ہیں نا باجی۔!“
 عدیل کے انداز اور نگاہوں سے ہی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ واقعی اس کی
 ذہانت کا قائل ہو گیا تھا۔
 فریجہ و فورسرت سے قمری ہوئی جا رہی تھی۔
 ”پاگل۔!“

کوئل ہونے سے بڑبڑاتی۔ فری کی اگر زبان پر اس کی تعریف تھی تو عدیل
 کی نظروں میں تھا کہ وہ اس سے بہت، بہت زیادہ متاثر ہوا تھا۔
 تب اس کی جنس کی فطرت بیدار ہوا تھی۔ وہ شرما گئی۔
 ”بھلا میں کیسے شعر کہہ سکتی ہوں۔ تم تو خواہ مخواہ ہی میری تعریفیں کرتی رہتی
 ہو۔“

پھر اس نے سب کچھ مذاق میں ٹالنے کے لیے عدیل کی طرف دیکھا۔
 ”میں تو لڑکی ہوں۔ اور کہاں ہم لڑکیاں اور کہاں یہ فنونِ لطیفہ۔! کیوں
 عدیل صاحب۔!“

اس پر فری نے زوردار قبضہ لگایا۔ عدیل جھینپ کر اپنا سر کھجاتے ہوئے
 جھٹ سے بولا۔

”باجی! سچ پوچھیے تو اب میں اپنی رائے پر نظر ثانی کرنے کے متعلق سوچ

رہا ہوں۔“

”وہ مارا۔“ فریجہ یک دم چپک اٹھی۔
 ”اجی آگے آگے دیکھیے گا کہ آپ جناب اپنی کس کس رائے پر نظر ثانی کرتے
 ہیں۔ اگر ایک ہفتہ کوئی میری باجی کے ساتھ گزارے تو میں۔ اپنی رائے دائے
 سب بھول بھال ان کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ کچھ ایسا سحر ہے میری باجی
 میں۔!“

”ارے بس بس۔!“
 فری نے تو حد کر دی تھی۔ کوئل جھینپی۔
 ”میری جھوٹی تعریفیں کر کر کے تم مجھے شرمندہ کر دیتی ہو۔“
 گویا کسی شاعر نے داد و وصول کرنے پر کہا ہو یہ تو آپ کا حسن سماعت ہے۔
 اسی انداز میں فریجہ بولی۔

”واللہ آپ تو کس نفسی سے کام لے رہی ہیں۔“
 یونہی بہت دیرینہ مذاق ہوتا رہا۔ اتنے عرصے میں کینز بے چاری کو چار
 بار تو چائے ہی بنانا پڑی۔ مگر وہ اپنی کوئل بی بی کے کام بڑے شوق و خلوص سے
 کیا کرتی تھی۔

”اوہ۔! باتوں باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ اٹھ بیج
 گئے۔“

عدیل نے گھڑی کی طرف نگاہ ڈالی اور گڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”گھر والے تو مجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے ہوں گے۔ خصوصاً امی تو

بہت جلد پریشان ہو جاتی ہیں۔

”جی ہاں۔ کیوں نہ ہوں“

فریچہ بے حد اس چہرہ بناتے ہوئے بولی۔

”اکلوتے بیٹے جو ٹھہرے۔ ادھر ہم ہیں کہ گھر واپس نہ بھی آئیں تو کسی کو پرواہ ہی نہیں ہوتی۔ کہ چلو کیا ہوا۔ دوسری جو موجود ہے۔ اور وہ بھی بہتر۔“
فری کی بات اور انداز نے فضا کو زعفران راز بنا دیا۔

”بڑی خراب ہو تم۔“

زرا ہنسی تھی تو کول نے بڑی پیار بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔
”کب کوئی تمہاری پرواہ نہیں کرتا۔ سب ہی تو تم پر جان چھڑکتے ہیں اور میں۔۔۔“

”آپ سب سے زیادہ۔ میں مانتی ہوں۔“

فری اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑی۔ پھر قدرے جھکی۔
اور ہاتھ پیشانی تک لے جاتے ہوئے لکھنوی انداز میں بولی۔
”ذرا نوازی ہے۔“

”یہ انداز باجی پر زیادہ چچے گا فریچہ عمران۔“

سارا دن اتنا اس نے عدیل کو تنگ کیا تھا۔ اتنا ستایا تھا۔ چھیڑا تھا تب بد لے کے طور پر شرارت سے اس نے کہا۔

مگر دل کے اندر اس کا معترف بھی تھا کہ یہ محض شرارت ہی نہ تھی بلکہ حقیقت تھی۔ صداقت تھی۔

باجی تو اپنی نزاکت، اپنے طور اطوار لب و لہجے اور انداز سے کوئی لکھنوی نوابزادی گنتی تھیں۔!!

”کھڑ تو جادو عدیل کے بچے۔“

فریچہ مگتا مان کر اس کے پیچھے بھاگی۔

وہ دوڑیں جیتا کرتی تھی۔ عدیل نے گھبرا کر کول کی پناہ لے لی۔
اسے ہی خدا حافظ کہنے کے لیے وہ ابھی ابھی اٹھ کر کھڑی ہوتی تھی۔

”باجی! مجھے اس خوفناک چیز سے بچائیے۔“

وہ کول کے پیچھے دبک کر بیٹھ گیا۔

بالکل بچوں کی طرح شریر اور معصوم تھے دونوں۔
کول مسکرا پڑی۔

”بس بھئی فری! مہمان کا کچھ لحاظ کرنا چاہیے۔“

کول نے ہنستے ہوئے دونوں کا بیچ بچاؤ کرایا۔

”اچھا پھر اجازت ہے۔“

جنگ بندی کا اعلان ہوتے ہی عدیل اپنی پناہ گاہ سے نکل آیا۔
ماچس، سگریٹ کیس، رومال۔ پتوں کی جیبوں میں ٹھونسنے کے بعد چہتر

ہاتھ میں تھام لیا۔

”اب پھر کب آئیے گا۔“

کول نے میزبانی کے فرائض احسن طریقے سے ادا کیے۔

”ارے باجی! ان سے کیا پوچھتی ہیں۔ آپ جب جب کہیں گی۔ میں کان سے

پکڑ کر لا حاضر کیا کروں گی۔

”مجھے کیا اعتراض ہے۔ بے شک روز آیا کریں۔ کچھ وقت ایسے ہی کھیل اور گپ شپ میں گزرنے سے میرا بھی دل بہل جایا کرے گا۔“
”شکریہ۔“

عدیل نے جھجک کر کومل کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ پھر بڑی عقیدت سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”آپ نے مجھے اکثر آجانے کی اجازت دے دی ہے۔ احسان ہے آپ کا۔ میں ضرور آیا کروں گا۔“

”آ۔“ فریجہ نے نعرہ لگایا۔

”دیکھا کیسا میری باجی نے۔۔۔“

اور ابھی اس کی بات بھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ عدیل باجی کو خدا حافظ کہہ کر اور فری کا منہ چڑا کر تیز تیز قدموں سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

کومل غسل کر کے نکلی تو کینز نے اپنی پسند سے اس کے لیے جو لباس منتخب اور استری وغیرہ کر کے تیار کر رکھا تھا اس پر نگاہ ڈالی۔
نیلا چوڑی دارپا جامہ اور لیس کا کرتہ۔
جتنی بار اس نے یہ لباس پہنا تھا ہر دیکھنے والے نے تعریف ہی کی تھی۔
اور اب جب بھی کسی خاص جگہ جانا ہوتا کینز اس کے لیے اسی کا انتخاب کرتی۔

کومل اس کے سادگی بھرے خطوط پر مسکرا پڑی۔
فریجہ یونیورسٹی جا چکی تھی۔ اس کے بعد ہی امی کی ایک ملنے والی کے ہاں سے قرآن خوانی کے لیے بلاوا آیا تھا۔
اس وقت اس کا کہیں بھی جانے کا موڈ بالکل نہیں تھا۔ مگر ایک تو

معاملہ قرآن خوانی کا تھا۔ دوسرے اسی کے اصرار پر تیار ہونا ہی پڑا۔
اور۔ اس موقع کے لیے اس کا خیال تھا کہ سفید لباس پہنے گی۔

”کینز۔“

کھڑکی کے سامنے کرسی کھینچ کر اس نے سر پیچھے ٹیک دیا۔ جیسے جیسے بال
پشت پر پھیلے تھے اور ان میں سے پانی کے قطرے موتیوں کی طرح ٹپ ٹپ
فرش پر گر رہے تھے۔

”جی کوئل بی بی۔“

”یہ کون سے کپڑے نکال دیتے۔؟“

”اچھے تو ہیں۔“

”میں کب کہہ رہی ہوں کہ خراب ہیں۔ موقع بھی تو دیکھو۔“

”کیوں بی بی! موقع کو کیا ہے۔؟“

”بھئی قرآن خوانی ہے۔“

”پھر۔؟“

”سفید والے نکالو۔ خدا کے حضور حاضری ہے۔“

”یہ آپ نے اللہ میاں کے لیے صرف سفید ہی کپڑے کیوں رکھ چھوڑے ہیں؟“

”کیا مطلب۔؟“

”اس نے تعجب سے کینز کی طرف دیکھا۔“

”میرا مطلب ہے کہ اور کہیں جلتے ہیں تو خوب سچ بن کر۔ رنگ برنگے

کپڑے پہن کر۔ بھلا لوگ اللہ میاں کے لیے کیوں اپنی سچ نہیں نکالتے۔“

وہ جو خود حسن ہے اور اتنی اتنی حسین مستیاں اس نے پیدا کی ہیں۔ پھر خود اس
کے لیے حسین بننے پر پابندی کیوں؟

”ارے ارے۔“

کوئل مسکرا پڑی۔ اس کی منطق تڑالی تھی۔

”یہ سفید رنگ پاکیزہ ہوتا ہے۔ اس لیے کینز بی بی۔“

”اور یہ رنگ بھی قدرت نے ہی ہمیں عطا کیے ہیں۔ پھول کتنے مختلف اور

بے شمار رنگوں کے ہوتے ہیں۔ پھر کیا ان میں سے صرف سفید ہی پاکیزہ ہوتے ہیں

باقی نہیں۔ قوس و قزح اتنے خوبصورت رنگوں کی کیوں ہوتی ہے۔ سفید کیوں نہیں؟

”اچھا بھئی اچھا۔“

کوئل اس وقت بحث کے موڑ میں نہ تھی۔

”یہی پہن لوں گی۔“

بات ختم کرنے کے لیے اس نے ہتھیار ڈال دیتے۔ ویسے کینز کی بات وہ

اکثر مان ہی لیا کرتی تھی۔ کہ وہ اس کی خدمت بہت کرتی تھی۔

”تو پھر جلدی سے پہلے پہن لیجیے۔ تاکہ پھر میں آپ کے بال سلجھا دوں۔“

کتنا مزہ آ رہا تھا یوں آنکھیں موند کر بیٹھنے کا اور سوچنے کا۔ مگر معاملہ کینز کا

تھا۔ اس نے تو ایک منٹ بھی سکون سے بیٹھنا دیکھ کر دینا تھا۔ پھر کیوں نہ

پہلے اس کی بات مان لے۔

استری والی میز پر سے کپڑے اٹھا، وہ ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔

”آہ! اباشار اللہ۔“

وہ باہر نکلی تو کینز اسے تعریفی انداز میں دیکھتے ہوئے اپنے ہاتھ والا کام
چھوڑ کر اس کے قریب آگئی۔

”لایئے اب بال بھی جلدی سے بنا دوں۔ جانے کب بیگم صاحبہ چلنے کا کہہ
دیں۔“

وہ چپ چاپ بیٹھ گئی اور کینز اس کے بالوں میں برش کرنے لگی۔
کتنا سکون اور کتنا مزہ آ رہا تھا۔

اس نے آنکھیں موند لیں۔ بڑی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ ہلکی پھلکی
اور مدہوش سی۔!

یہ انسان کے خیالات کی دنیا۔! کتنی دلچسپ اور پرکشش ہوتی ہے۔
اپنی دنیا۔! جس میں انسان گم ہو جاتا ہے۔ کھو جاتا ہے۔ سکون ہی سکون۔!
اطمینان ہی اطمینان۔!!

جانے کون کون سی سوچیں تھیں جو دماغ میں گھسی چلی آرہی تھیں۔ کینز
کے ہاتھوں کا ہلکا ہلکا مس بڑا خوشگوار تھا۔ وہ پوری طرح ڈوب گئی۔
جانے کتنی دیر یوں ہی کھوتی رہی تھی۔ کہ فری کی کھن کھن کرتی ہنسی کانوں
میں اتر گئی۔ چونک کر اس نے آنکھیں کھولیں۔

وہ اس کے عین سامنے کھڑی تھی اور ساتھ۔ لمبر بھر کے لیے اس کی
آنکھوں میں اجنبیت کے سائے لہرائے۔

”یہ عدلی ہے باجی۔!“

جانے کیوں فری ہنسے ہی جا رہی تھی۔

”اوہ۔!“ کوئل جلدی سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

لباس بدلاتھا تو اس کی شخصیت بھی کتنی بدل گئی تھی۔ آج اس نے سفید
گھیردار شلوار اور سفید کرتا پہن رکھا تھا۔

جس سے وہ اس دن کی طرح کھلنڈرا سا لٹکا نہیں لگ رہا تھا بلکہ بڑا وجیہ،
بڑا باوقار اور انتہائی مدبر سا مرد دکھائی دے رہا تھا۔

شاید تبھی وہ پہلی نگاہ میں اسے پہچان نہیں سکی تھی۔!

”تو آپ مجھے بھول گئیں باجی۔!“

اس کے لہجے میں شکوہ تھا مگر نگاہیں قدرے تیز لیے اسے سر سے پاؤں
تک گھور رہی تھیں۔

”نہیں تو۔ بھولی تو نہیں!“

کوئل نے اس کا دل رکھنے کے لیے مقرر اس کا جھوٹ بولا۔ ورنہ یہ حقیقت
تھی کہ وہ اسے بالکل پہچان نہیں پائی تھی۔

”بس ذرا آج لباس مختلف تھا نا!“

”سچ بھی ہونٹوں تک آگیا۔“

”بہت بڑے لگ رہے ہو۔“

”اور آپ اس دن سے بھی زیادہ مٹی سی۔“

اس کی نگاہوں میں اس کے لیے پسندیدگی تھی۔

”یہ نیلا رنگ۔ میرا پسندیدہ رنگ ہے۔ اور آپ پرچ بھی خوب رہا ہے۔“

اس نے بڑی سادگی سے اس کی تعریف کی۔

”شکریہ۔“

کول نے کنیز کے ہاتھ سے برش لے لیا۔

”جاد تم چائے وغیرہ کا بند و بست کرو۔“

”باہی! آپ نے مجھ سے میری اس بے تحاشا ہنسی کی وجہ نہیں پوچھی؟“

فری اب تک ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔

”اس کا تو داغ خراب ہے۔ ہے نا باہی۔“

جانے کیا بات تھی۔؟ عدیل اس ذکر سے کترار ہوا تھا۔

”داغ تو آپ کا خراب ہے۔ میں بتاؤں باہی اصل بات۔؟“

کول بڑی دلچسپی سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

”باہی! یہ آپ کی بہن آپ کی لگتی نہیں۔ جانے یہ آپ سے اتنی مختلف

کیوں ہے۔؟“

عدیل نے گھور کر فریحہ کو دیکھتے ہوئے پھر بات بدلی۔

”میں میں ہوں۔ باہی باہی۔ دو مختلف انسان۔ پھر مختلف کیوں نہ ہوں۔“

چمک کر عدیل کو جواب دینے کے بعد وہ پھر کول کی طرف گھوم گئی۔

”پچھلے جمعہ کو عدیل یہاں آئے تھے نا۔؟“

”اں۔“

”تو آج بھی جمعہ ہے۔ پورے آٹھ دن ہو گئے۔“

”تو۔؟“

”یہ بھلا ہنسنے کی بات تھی۔ کول نے حیرت سے فریحہ کو دیکھا۔“

”اور ان آٹھ دنوں میں سینکڑوں بار انہوں نے مجھ سے یہ پوچھا ہوگا۔؟“

”خواہ مخواہ ہی۔“

عدیل نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے بڑے شرمیلے سے انداز میں

سر جھکا لیا۔

لباس سے جتنا باوقار اور سنجیدہ لگ رہا تھا۔ اس کے ایک ہی فقرے

نے سارا تاثر ختم کر دیا۔

وہ پھر وہی کھنڈرا اور معصوم سا لڑکا تھا۔!

”خواہ مخواہ کیوں۔؟“

فریحہ شاید آج اسے معاف نہیں کرنے والی تھی۔

”باہی نے مجھے بلایا ہے۔؟ باہی نے مجھے بلایا ہے۔؟ بس باہی! جتنی بار

دن میں میری ان سے ملاقات ہوتی تھی یہ مجھ سے ہر بار یہی پوچھتے تھے تب

آج ان کی یہ بے قراری دیکھ کر میں نے جھوٹ موٹ کہہ دیا کہ بلایا ہے۔ اور

یہ فوراً بھاگ بھاگ میرے ساتھ آ گئے۔“

فریحہ کی ہنسی پھر چھوٹ گئی۔ وہ پیٹ پکڑ پکڑ کر سننے لگی۔

”جھوٹ بولا تھا۔؟“ پھیکے سے تبسم کے ساتھ عدیل بڑبڑایا۔

یکدم کول کی نگاہ عدیل کے چہرے پر جا پڑی۔ بڑا شرمندہ ہو گیا تھا شاید

چہرے پر تاریک سے سائے لہرائے اور نگاہیں یکایک جھک گئیں۔

اس کی یہ کیفیت۔!

کول کا دل بے چین سا ہو گیا۔ جانے کس مان سے اس نے پوچھا تھا۔؟

”نہیں تو۔“ کوئل جھٹ سے بولی۔

”فری جھوٹ تو نہیں بول رہی۔“

”کیا باجی۔؟“

”تم سے ہر روز تو میں ان کا پوچھتی تھی۔ اور یہ بھی کہتی تھی کہ کسی دن پھر ساتھ لانا۔ ذرا گپ شپ رہے گی۔“

ساتھ ہی کوئل نے فری کو آنکھ سے اشارہ کر دیا۔

”پتخ باجی۔؟“ یکدم عدیل کے چہرے پر رنگ سا دوڑ گیا۔

”پتخ کہہ رہی ہیں نا۔؟“

”تو بہ باجی۔؟“ فریجہ بہت جلد بہن کا اشارہ سمجھ لیا کرتی تھی۔

”ذرا مجھے انہیں تنگ تو کر لینے دیتیں۔“

باجی کی بات کا مان رکھنے کے لیے وہ قدرے بسوری۔ عدیل کے چہرے

پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”میں بھی سوچ رہا تھا کہ میں نے باجی کو اتنا یاد کیا ہے۔ کیا بھلا دل کو دل

سے راہ نہیں ہوتی۔! یقیناً باجی نے بھی مجھے اتنا ہی یاد کیا ہوگا۔“

انتہائی معصومیت سے اس نے کوئل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دل

کی بات کہہ دی۔

”ہاں ہاں۔ دل کو یقیناً دل سے راہ ہوتی ہے۔“

کوئل نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

فریجہ بڑے انداز سے مسکرانے لگی۔ بھلا ہو کینز کا جو اس وقت چائے لے

آئی۔ اس میں لگ کر سب کا بھرم رہ گیا۔

”ہنگم صاحبہ کہہ رہی ہیں کوئل بی بی۔! تیار ہیں تو آئیے چلیں۔“

چائے لگاتے لگاتے کینز نے امی کا پیغام دیا۔

”اچھا۔“

”آپ کہیں جا رہی ہیں باجی۔؟“ فریجہ نے پوچھا۔

”مہتر صدیقی کے ہاں قرآن خوانی ہے۔“

کوئل مختصر سا جواب دے کر چائے بنانے لگی۔

”تو ابھی جا رہی ہیں۔؟“

عدیل نے بے تابی سے پوچھا۔

”نہیں۔ کل جائیں گی۔“

فریجہ نے اس کی نادانی کا مذاق اڑایا۔

”اور ہم جو آئے ہیں۔“

وہ کوئل ہی کی طرف متوجہ تھا۔

”میں تو آپ سے باتیں کرنے اور آپ کی سننے آیا تھا۔ نہ جاسیے آج۔“

میری خاطر۔!

بڑے ملتی انداز میں اس نے کوئل کے ہاتھ تھام لیے۔

”ایسی ہی تو اعلیٰ چیز ہیں آپ۔“ فریجہ پاس سے بڑبڑائی۔

”آپ چپ رہیے فریجہ صاحبہ! دیکھیے باجی! یہ آپ کو صرف اپنی ملکیت

سمجھتی ہے۔ اور ہم جیسے آپ کے کچھ بھی نہیں۔“

”ہاں۔ یہ تو حقیقت ہے۔ باجی میری سگی بہن ہیں۔ یوں صرف میری بہنیں
فریحہ کی بات سے یکدم افسردہ ہوتے ہوئے اس نے کول کے ہاتھ
چھوڑ دیئے۔

”نہیں نہیں۔ میں تم دونوں ہی کی ہوں۔“
عدیل کی یہ افسردگی اور معصومیت کول کو بے حد پیاری لگی۔
”بالکل ایک جتنی۔“

”خواہ مخواہ۔“ فریحہ نے پھر عدیل کو چھڑنے کے لیے کہا۔
”یہ تو دنیا زمانہ جانتا ہے کہ آپ میری اور صرف میری باجی ہیں۔ اور کسی
کی نہیں۔“

”بعض رشتے اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے ہوتے ہیں اور بعض انسان خود
بناتے ہیں۔ اور۔ خود بنائے ہوئے رشتے انسان کو زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔“
”وہ مارا۔!“

عدیل کول کی بات سمجھ کر فوراً مسرت سے چلا اٹھا اور پھر۔ فریحہ کا منہ
چڑانے لگا۔

”دیکھانا۔ کیا باجی نے منہ توڑ جواب دیا ہے۔ میں انہیں تم سے زیادہ عزیز
ہوں۔“

”وہ تو تمہارا دل رکھنے کو انہوں نے کہہ دیا ہے۔“
فریحہ لا پرواہی سے کندھے جھٹک کر چائے پینے لگی۔ اور عدیل انتہائی
ممنون نگاہوں سے کول کو دیکھنے لگا۔

کیسا انہوں نے اس کا مان رکھ لیا تھا۔ واقعی باجی کی شخصیت عظیم تھی۔!
”چلیے ناکول بی بی۔“ کینز پھر آئی۔

”بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں۔“
”بس دو گھونٹ چائے کے رہ گئے ہیں۔“

”نہ جاتیے باجی۔!“
عدیل نے اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے پھر منت کی۔

”سچی! میں صرف آپ سے ملنے آیا تھا۔“
”تم دونوں بیٹھو۔ کوئی کتابیں وغیرہ دیکھو۔ میں بس جلد ہی آ جاؤں گی۔“
”نہیں۔ اس نے بالکل بچوں کی طرح ضد کی۔

”آپ کی جگہ فریحہ چلی جائے۔“
”پاگل۔!“ کول مسکرا پڑی۔

”یہ موقع ایسا نہیں تاکہ جانے سے انکار کر دوں۔“
”تو ٹھیک ہے باجی! میں چلی جاتی ہوں۔ عدیل کی بات بھی رہ جائیگی۔“
”لیکن۔۔۔“ کول نے کچھ کہنا چاہا مگر فریحہ پھر جلدی سے بولی۔

”آپ کا خیال ہے کہ آپ کو گناہ ہوگا۔“
”وہ میرے سر باجی! وہ میرے سر۔“

عدیل جھٹ سے بول پڑا۔
”بس آپ نہ جاتیے۔“

”کبھی کے سر بھی نہیں۔“

فریحہ نے چائے کا آخری گھونٹ لیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”ویسے بھی مجھے سرصدیقی کے ہاں جانا ہی تھا۔ دو کاج ہو جائیں گے۔“
 ”کیوں جانا تھا؟“
 ”وہ ان کی شہلا کے پاس میری نوٹس والی کاپی ہے۔ وہی شہلا صدیقی
 عدیل۔!“
 ”کون سی؟“
 ”وہ جس کے بال بہت لمبے ہیں۔ اور جس دن وہ انہیں کھلا چھوڑ کر
 آتی ہے تو سب لڑکے مر جاتے ہیں۔“
 ”کوئل کو ہنسی آگئی اور عدیل خفیف سا ہو کر بڑبڑایا۔
 ”سب کب؟“
 ”اب باجی کے سامنے بننے کی کوشش مت کرو۔“
 ”فریحہ قبضہ لگا اٹھی۔
 ”ایسی باتیں تو ہم جماعتوں کے ساتھ ہوتی ہی رہتی ہیں۔“
 ”کوئل نے گویا اس کی طرف داری کی۔
 ”ہاں تو۔“ وہ جیسے سنبھل گیا۔
 ”دیکھیے نا باجی۔! یہ فریحہ مذاق کی باتوں کو بھی سنجیدہ سمجھ لیتی ہے۔ آپ نے
 تو وہ شہلا صدیقی دیکھی ہی ہوئی ہوگی۔؟“
 ”اے اے۔“
 ”تو کیا وہ ایسی ہے کہ لڑکے مرنے لگیں۔؟“

پھر جانے عدیل کو کیا سوچھی۔ یکدم اٹھ کر کوئل کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔
 ”ایمان سے باجی۔! اس نے کوئل کے بال دونوں ہتھکوں میں تھام لیے۔
 ”آپ کے بال اس سے کہیں زیادہ لمبے اور خوبصورت ہیں۔“
 ”ارے ارے! کوئل چھینپی۔ شرمائی۔
 عجیب سا لڑکا تھا۔! کیسے یکدم تعریف کر دیتا تھا۔ اور وہ۔ کچھ بھی تھا۔
 بے شک اس سے بڑی ہی تھی۔ مگر مشرقی کنواری لڑکی تھی۔
 اپنی اس انداز میں تعریف سن کر شرماسی گئی۔
 ”ہج کہہ رہا ہوں باجی! آپ اس سے کہیں زیادہ اچھی ہیں۔ ہر لحاظ میں
 شکل و صورت کے علاوہ ذوق اور۔۔۔“
 ”اور؟“ پاس سے فریحہ بڑے انداز سے بولی۔
 ”پھر یہ تو طے ہو گیا نا کہ عورت جیسی ناقص العقل ہستی اٹلیکچول نہیں ہو
 سکتی۔“
 ”تو بہ تو بہ! نعوذ باللہ! وہ میں نے باجی کے متعلق کب کہا تھا۔؟“
 ”تو جناب! آپ کی موٹی ٹیسی عقل میں یہ بات آجانی چاہیے کہ میری باجی
 ایک عورت ہیں مرد نہیں۔ لہذا۔ کل ہماری پارٹی آپ کی طرف۔ کیوں شرط
 لگائی تھی۔؟“
 ”سرخم ہے محترمہ۔! عدیل نے جھٹ اپنی شکست تسلیم کر لی۔
 ”باجی کے سرصدیقے میں جو کہو گی کھلا دیں گے۔ جس قسم کی پارٹی کہو
 گی دے دوں گا۔“

کوئل مسکرا دی۔ عدیل کی سادگی اور معصومیت پر۔ اور فریحہ کے مان اور اعتماد پر۔ جو اس کے دل میں بہن کے لیے تھا۔
 ”اچھا بھئی۔! پھر ہم تو چل دیئے۔ اتنی اب خود آوازیں دے رہی ہیں اور باجی! عدیل کو بورنہ ہونے دیجئے گا۔“ وہ جاتے جاتے بولی۔
 ”تم جارہی ہو۔ میری ساری بوریٹ دوڑ ہو گئی۔ البتہ باجی جاتیں تو تب اس کا امکان تھا۔“

دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کو کاٹتے ہی کہتے تھے۔ کوئل دلچسپی سے سن رہی تھی مگر فریحہ شاید جاچکی تھی۔ عدیل کی بات کا کوئی جواب نہ ملا تو کوئل بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آپ کہاں چلیں۔؟“

عدیل نے جیسے بے قرار ہو کر پوچھا۔
 ”میں اب جا تو رہی نہیں۔ لہذا لباس تبدیل کر کے ذرا اطمینان سے بیٹھوں۔“
 ”نہیں نہیں۔“

عدیل اسے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔
 ”اس لباس میں، اس رنگ میں، آپ بے حد اچھی لگ رہی ہیں۔ میرے پاس اسی طرح بیٹھئے۔ جب چلا جاؤں گا تب بدل لیجیے گا۔“
 ”لیکن؟ وہ کچھ شرمائی۔ کچھ جھجکی۔ کچھ بوکھلائی۔“
 ”لیکن دیکھن کچھ نہیں۔“

عدیل نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے زبردستی اپنے پاس بٹھالیا۔

”یہی سمجھ لیجیے کہ کہیں مہمان گئی ہوئی ہیں۔“

پھر وہ بڑے معصوم بڑے پیارے انداز میں مسکرایا۔
 ”اور میں آپ کا میزبان بن جاتا ہوں۔ اور چائے پیتیں گی۔؟“
 میزبان بن کر وہ پوچھ رہا تھا۔

”تم پیو گے تو میں بھی پی لوں گی۔“

کوئل مسکرائی۔ عدیل کی حد درجہ اپنائیت نے اسے بھی قدرے بے تکلف کر دیا۔

”ضرور ضرور۔ آپ کے ساتھ بیٹھ کر تو سینکڑوں پیالیاں پی جاؤں۔“
 چائے کی ٹرے اپنے آگے گھسیٹ کر وہ پیالیوں میں چائے انڈیلنے لگا۔
 ”اور آپ ذرا ہمیں کوئی پیاری سی غزل سنا دیجئے۔ ترم کے ساتھ۔“
 جانے خدا نے آپ ہی کو ہر نعمت سے کیوں نواز رکھا ہے۔ ہم تو بس ایسے ہی دنیا میں آگئے۔“

اور وہ۔ بڑی عقیدت اور بڑے احترام سے کوئل کو دیکھنے لگا۔

کتاب پڑھنا چاہی۔ اس میں دل نہ لگا۔ بُنائی کرنا چاہی۔ اس کی طرف
طبیعت راغب نہ ہوئی۔ لڑائی کے کور کروٹھے سے بہا رہی تھی۔ خاصا دلچسپ
کام تھا۔ مگر اس وقت وہ بھی کرنے پر جی رضامند نہ ہوا۔

سب کچھ دیوان پر پھیلا چھوڑ نیچے قالین پر جا بیٹھی۔ ریڈیو لگایا۔ پروگرام
اچھا نہ لگا۔ وہی اداسی۔ وہی دیرانی۔ ارد گرد پھیلی محسوس ہوتی رہی۔
تب گھٹنوں میں چہرہ چھپا کر چپ چاپ بیٹھ گئی۔ جانے کتنا وقت گزر
گیا۔ اسے کوئی احساس نہ تھا۔

بس یہی خیال آئے جا رہا تھا کہ وہ کیسی بے مقصد اور زندگی سے خالی زندگی
گزار رہی تھی۔

آخر ایسا کیوں تھا۔؟ آخر ایسا کیوں تھا۔؟ اس سوچ کے ساتھ ساتھ
آبا کے لیے ہلکا سا شکوہ اس کے ذہن میں گھس آیا۔
آبا کو اس کی گزرنے والی اس بے مقصد زندگی کا احساس ہونا چاہیے تھا۔
انہیں اسے اجازت دے دینا چاہیے تھی کہ وہ کچھ کر لیتی۔ دفتر کی ملازمت بھی
کبھی سکول میں ہی بچیوں کو پڑھانے کی ذمہ داری اٹھا لیتی۔ زندگی کا کوئی مقصد
تو ہوتا۔!

وہ جس راہ چلنا چاہتی تھی آبا اپنے لاڈ پیار کے سلسلے میں اور اپنی اتھاہ غلطیوں
کو نگاہ میں رکھ کر وہ راستے بند تو نہ کر دیتے۔
کچھ اس کی بھی توسعیں تھیں۔ کچھ اس کے بھی تو جذبے تھے اور کچھ اس
کے بھی تو عزائم تھے۔!!

فریج یونیورسٹی چلی جاتی تھی تو گھر میں کیسی اداسی سی چھا جاتی تھی۔
اتنی نیچے کام کرتی رہتیں اور وہ ناشتے سے فارغ ہو کر کچھ دیر ان کے پاس
بیٹھنے کے بعد اوپر اپنے کمرے میں چلی آتی۔
ویسے اسے یہ تنہائیاں پسند بہت تھیں مگر جانے کیوں کبھی کبھی اسے انہیں
تنہائیوں سے خوف سا آنے لگتا۔ تب اسے فریج کا یونیورسٹی جانا کچھ ایسا اچھا
نہ لگتا۔

کہ اسے ہر دم بولتے رہنے کی عادت تھی اور یوں گھر میں اک ہنگام سا بپا
رہتا تھا۔ شور و غل مچا رہتا تھا۔
اور آج وہی دن تھا۔ اکتا ہٹ کا۔ بوریٹ کا۔ اداسی کا۔ من کے اندر
سے ہی کہیں سے دیرانیاں پھوٹ نکلی تھیں۔

”باہی۔!“

بڑی مدھم سی پکار تھی۔ شاید اس کے اڑتے بکھرتے تصورات کی بازگشت تھی۔ وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔

”باہی۔!“

اب ذرا آواز بلند تھی اور ساتھ ہی شانے پر کسی بھاری اٹھ کا ہلکا سا دباؤ۔!

کوئل نے جلدی سے چہرہ گھٹنوں میں سے نکالا۔

عدیل اپنی تمام تر معصومیتوں کے ساتھ اس کے قریب ہی بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ کوئل کھل اٹھی۔

وہ اچھے وقت آیا تھا۔ کم از کم اس کے اندر مچھلیں ویرانیاں کچھ دیر کے لیے سمٹ تو جائیں گی۔!

اس سے باتوں میں، گپ شپ میں لگ کر وہ کچھ دیر کے لیے بہل تو جائے گی۔

”ارے! تم کب آئے۔؟“

اس نے بڑی مشتعلی سے پوچھا۔

”ابھی ابھی۔ کیا سو رہی تھیں۔؟“

”نہیں تو۔ جانے کیوں دل بڑا سخت اُداس ہو رہا تھا۔“

عدیل کا غمگن سا چہرہ سامنے پا کر اس نے من کی بات صاف کہہ دی۔

”تو پھر اچھے وقت آیا ہوں نا۔؟“

”ہاں۔ بالکل۔“

وہ بڑے خلوص سے بولی مگر دوسرے ہی لمحے چونک سی پڑی۔

”لیکن تم آج یونیورسٹی نہیں گئے۔؟“

”کیا تو تھا۔ مگر ایک پیریڈ گزرنے کے بعد میری چھٹی جس نے مجھے کہا کہ جاؤ عدیل! اس وقت تمہاری باہی کو تمہاری سخت ضرورت ہے۔ میں نے کہا۔ اپنی باہی پر سے قربان۔ اور پھر اسی وقت سائیکل پکڑی اور آپ کے پاس بھاگ آیا۔“

اتنے پیارے انداز میں اس نے خلوص و اپنائیت کا اظہار کیا تھا کہ کوئل کو اس پر بے تحاشا پیار آ گیا۔

”بڑے گپ باز ہو۔!“

وہ ہنسی۔ ساتھ ہی اک سوچ نے اسے سنجیدہ بھی کر دیا۔

زندگی کا یہ وقت اس کا یوں ضائع کرنے کا نہیں تھا۔ ایک ایک لمحہ بڑا قیمتی تھا۔!

”لیکن جناب عدیل میاں! باہی بڑی نرم بھی ہے اور خاصی سخت بھی۔ پڑھائی کا وقت ادھر ادھر گنوا نا سخت گناہ۔ ناقابل معافی گناہ۔ چلو اٹھو۔ ابھی۔ فوراً۔ اتنا ہی باہی سے ملنے کو بے تاب ہو گئے تھے تو شام کو آ جانا تھا۔ چلو۔ کلاسیں نہیں چھوڑنی۔“

کوئل نے جلدی سے اٹھ کر اس کا بازو تھاما اور کھینچ کر کھڑا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

”ماتا کہ آپ مجھ سے بڑی ہیں۔ مگر یہ مت بھولیے کہ میں ایک مرد ہوں۔
اور عورت مرد سے بیس سال بھی بڑی ہو جائے وہ صنفِ نازک ہی
رہے گی۔“

کومل نے اتنا زور لگایا تھا مگر اسے اس کی جگہ سے اپنچ بھر بھی نہیں ہلا
سکی تھی۔ وہ ہنسے جا رہا تھا۔

آخر تھک کر کومل نے اس کا بازو چھوڑ دیا۔
”لیکن عدیل! تم بھی یہ مت بھولو کہ میں تمہیں بگڑتا دیکھوں گی تو خاموش
رہوں گی۔ جس طرح فریج کے لیے میں ہمیشہ بہتری چاہتی ہوں۔ اسی طرح تم ہو۔
تم مجھے اچھے لگتے ہو۔ اور میرا جی چاہتا ہے تم بہت بڑے آدمی بنو۔ یا کم از کم اپنے
مک کے لیے ایک انتہائی کا در آمد فرد۔“

”ارے ارے۔ امیری بے حد پیاری باجی آپ تو بالکل سنجیدہ ہو گئیں ہیں
بگڑ کب رہا ہوں۔ انشاء اللہ آپ کی خواہشات پر پورا اُتروں گا۔“
”اور اس وقت۔۔۔ یہ پڑھائی چھوڑ چھاڑ۔۔۔“

”کون پڑھائی چھوڑ کر آیا ہے۔؟“
اس نے کومل کی بات درمیان سے ہی پکڑ لی۔
”وہ تو ہمارے ایک پروفیسر صاحب نہیں آئے تھے۔ دوپہر بیٹہ خالی تھے۔
میں نے سوچا۔ یہاں ادھر ادھر آوارہ پھر کر۔“
پھر وہ شوخی سے مسکرایا۔

”لڑکیوں پر آواز کے کس کس لڑکوں سے شرارتیں کر کے جو وقت ضائع

کروں گا وہ کیوں نہ اپنی باجی! اپنے پیرو مرشد کے پاس گزاروں۔ یہاں سے تو
کچھ حاصل بھی ہوگا۔“

”پاگل۔!“

کومل پھر شرما گئی۔

”تم بڑے خراب ہو۔ ہر وقت ہی ایسی باتیں کرتے رہتے ہو۔“

”آپ شرما رہی مجھے اچھی جو لگتی ہیں۔“

وہ پھر شرما رہی۔ بڑی بے ساختہ ادا تھی۔

”یہ دیکھیے۔ یہ آپ کا انار کی کلیوں جیسا سونچ چہرہ۔!“

”توبہ توبہ! عدیل، لڑکیوں کی صحبت میں رہ کر تم کیسی کیسی باتیں کرنا سیکھ
گئے ہو۔“

”لڑکیوں کی نہیں۔ یہ صرف آپ کی صحبت کا اعجاز ہے۔ وہاں آپ جیسی

کوئی نہیں۔ یہ فقرہ میں نے پہلی بار۔۔۔“

”تو پھر شرم کرو۔ میں تمہاری باجی ہوں۔“

وہ ابھی تک گلنا رہتی۔

”کیوں۔؟ جو باجی ہو اسے تعریف کرانے کا کوئی حق نہیں ہوتا۔؟ آپ

کو خدا نے یہ سب اتنے سارے خزانے دیئے ہیں۔ پھر دوسروں کی تعریف نہ

کرنا بھی کنجوسی اور زیادتی ہے۔“

”اچھا اچھا۔ اپنی منطق اپنے پاس رہنے دو۔ یہ بتاؤ چاہتے ہو گے۔“

”ضرور۔ پھر اس نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔“

”بارہ بجے میرا لیکچر ہے۔ پونے بارہ یا بارہ بجنے میں دس منٹ ہوں گے تو دفائع ہو جاؤں گا۔“

وہ بڑے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولتا چلا گیا۔

”لہذا اس اتنے وقت میں آپ جو کچھ کھلا پلا سکتی ہیں مجھے کھلا پلا دیجیے ساتھ ایک پیاری سی، خوبصورت سی، ترم کے ساتھ غزل یا گیت بطور چٹنی۔“

”نہیں بھئی۔ چائے۔ گرام گرم پکوڑے اور بس۔!“

”پکوڑے کھلائیں گی۔ پھر تو ساتھ چٹنی ضروری ہوگئی۔“

”آج میرا گلا خراب ہے۔“

”میرا تو نہیں نا۔ مجھے تو چٹنی کھانے سے کوئی پرہیز نہیں۔“

”میرا موڈ خراب ہے۔“

”میں آیا ہوا ہوں۔ پھر بھی خراب ہے۔؟“

بڑے مان سے اس نے پوچھا تھا۔ کومل چُپ سی ہوگئی۔ ورنہ اندر اسی طرح بکھرا بکھرا سا تھا۔

وہ اپنے سوال کے جواب کے لیے بڑی بے قراری سے اسے تک رہا تھا۔

آخر اس نے اس کا دل رکھنے کو کہہ دیا۔

”نہیں اب تو خراب نہیں۔“

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

”اچھا پھر کینز کو چائے کا کہہ آؤں۔“

”جلدی آجانیے گا۔ ایک منٹ میں۔“

”بھئی جلدی آجاؤں گی۔ ایسی پابندی نہ لگایا کرو۔“

”اتنی تیز سائیکل دوڑا کر، ایک ایک لمحہ پکڑ کر آپ کے پاس آیا ہوں آپ کو کچھ احساس ہی نہیں۔“

”بہت ہے۔“

کومل وہیں بیٹھ گئی۔

”اب خود ہی جا کر چائے کا کہہ آؤ۔ میں کہیں تمہارا کوئی لمحو ضائع نہ کر دوں۔“

”یہ ہونی نا بات۔“

اور وہ اُٹھ ہی رہا تھا کہ کینز خود ہی چائے کا ٹرے لیے آگئی۔

”جگ جگ جیو کینز بی بی۔! من کی مرادیں پاؤ۔“

”آپ بھی میاں۔“

کینز انداز سے ہی صدقے واری ہوگئی۔

”سدا خوشیاں دیکھیں۔ یہ دیکھیے کیسے گرام گرم پکوڑے بنا کر لائی ہوں۔“

”اور چٹنی کا انتظام ہمارا اپنا ہے۔“

عدیل نے مسکرا کر کومل کی طرف دیکھا۔

”کہاں۔؟ ساتھ لاتے ہیں۔؟“

”نہیں۔ یہیں سے ملے گی۔“

”وہ رات والی کومل بی بی نے مکہ چھوڑی ہوگی نا۔ انہوں نے خود ہی بنائی تھی۔ پکوڑوں کے ساتھ کچھ اور بھی زیادہ مزہ دے جائے گی۔“

دونوں بے اختیار ہنس پڑے۔
 ”اور اب تم جاؤ کینز بی بی! ہمیں اطمینان سے کھانے دو۔ ورنہ زیادہ کھاتے
 دیکھ کر تم نظر لگا دو گی!“

عدیل ہنستے ہوئے بولا۔

”نہیں میاں۔ میری آنکھوں میں خاک، نظر کیوں لگاؤں گی؟
 کینز تیز تیز قدم اٹھاتے کرے سے باہر نکل گئی۔

”آنکھوں میں خاک۔ منہ میں خاک کے ذرن پر۔ باجی! آپ کی تو کینز بھی کافی
 ادبی قسم کا ذوق رکھتی ہے۔“
 ”ہاں“ کوئل سکرائے لگی۔

”پھر؟“ عدیل پھر اسی موضوع کی طرف لوٹ آیا۔

”اتنی دُور سے یہی آس لے کر آیا ہوں۔ بے مراد نہ لٹائیے۔ میری بے پلایا
 خواہش اور چاہت کے صدقے میں۔ کوئی دو چار شعر ہی ہو جائیں۔ کسی کی مراد
 پوری کرنے والے کی اپنی مراد میں خدا۔۔۔“

”اچھا اچھا۔ باتیں کم۔“

اس نے بڑے انداز سے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔

”اور آپ کیوں مجھ پر ہر وقت کرفیو لگاتی رہتی ہیں؟“

”مجھے سچی ہے۔ میں بڑی ہوں۔“

”اٹے ہٹے! اللہ میاں تو نے مجھے چھ سال پہلے کیوں نہ دنیا میں بھیج دیا۔“

آج اس کوئل سی باجی کے آگے سر توڑ جھکانا پڑتا۔ پھر لکڑی کا ڈھب ڈالنا۔

”تم نے تو کہا تھا کہ عورت بیس تیس سال بھی چھوٹی ہو تو مرد مرد ہی ہوتا ہے
 اور عورت نازک۔! وہ بڑا وہ چھوٹی۔؟“
 ”اس عمر والی بڑائی چھوٹائی کو تو میں خاطر میں نہیں لاتا۔ مانتا ہی نہیں۔
 دراصل۔“

عدیل سر کو کھجلاتے ہوئے ہوئے سے بولا۔

”میں آپ کی اس بڑائی سے مرعوب ہو جاتا ہوں جو آپ کے منہ سے،
 خوبصورت سے سر کے اندر اس بھیجے میں ہے۔“

عدیل نے کوئل کا سر ایک اٹھ کی انگلیوں میں تھام کر ادھر ادھر بلایا۔
 ”بس! یہ مجھے الٹ پلٹ کر دیتا ہے۔ سارا حساب ہی خراب ہو جاتا ہے۔“
 ”پھر بیکنے لگے۔ چلنے نہیں پیو گے۔؟“

”ضرور، ضرور۔“

کوئل کی طرف دیکھتے دیکھتے ہی اس نے پیالی ہونٹوں سے لگالی۔

”اٹے! ایک دم اس کے منہ سے صدا نکلی۔“

کوئل ہنس ہنس کر دھری ہوئی لگی۔

”اور مجھے تمہارے بھیجے پر افسوس ہے۔ جانے اس میں کیا بھرا ہوا ہے۔؟“

عدیل نے خفیف سا ہوتے ہوئے جلدی سے بڑا سا پکڑا اٹھا، ثابت کا ثابت

منہ کے اندر رکھ لیا۔ وہ بھی گرم تھا۔

”م۔م۔م۔ مر گیا۔ بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔“

”صبر سے۔“

کوئل پھر منسی۔

”اُپ کے پاس آکر جانے مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ ویسے سچی باجی! میں اتنا بھی بے وقوف نہیں ہوں۔ بس اُپ۔ اُپ۔ کچھ نہیں۔ تو پھر اُپ کچھ سنائیے گا نہیں۔؟“

بہت تالیا تھا بے چارے کو۔! کوئل کو اس پر ترس آگیا۔
ہلکی ہلکی، مدھم مدھم گنگناہٹ کے بعد فیض کی مشہور نظم ’لذتیں اور بھی ہیں‘ ترنم کے ساتھ گانے لگی۔
اور عدیل۔ چلتے وائے۔ پکوڑے شکوڑے سب بھول بھال۔ صرف۔
اور صرف۔ اس میں ڈوب گیا۔

وہ تقریباً روز ہی آتا تھا۔

کبھی کوئی پیریدہ خالی ہوتا۔ اس وقت کبھی سہ پہر کو۔ کبھی شام کو۔ غرض جب بھی وقت ملتا۔ آ ضرور پہنچتا۔!
کتنی اچھی تھیں فریج کی باجی!
ہمیشہ اتنی خوبصورت مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرتیں کہ اس کا دل و
دماغ تو کیا تمام کا تمام وجود منور ہوا اٹھتا۔
اس کی مسکراہٹ کی تجلی سے کم از کم اسے تو ایسا ہی محسوس ہوتا تھا۔
اس کے علاوہ۔ اس کا خلوص و اپنائیت۔! اس کی باوقار اور پرکشش
ہستی کا مقناطیس۔!! اس کی عقل و دانش بھری فلسفیانہ گفتگو۔! اس کا مترنم لب
لہجہ۔ اور بلند فوق۔!!!

اس کا تو دل چاہنے لگا تھا کہ ہر ایک دن چوبیس گھنٹوں کے بجائے دو چار سو گھنٹوں کا ہو جائے تو وہ مسلسل اتنی اتنی دیر دہاں بیٹھا رہے۔
 پھر۔؟ جانے کیا ہوا۔؟ کیوں اس کے دل میں خدشہ سرا بھانسنے لگا کہ کہیں کوئل کے گھر والے اس کی اس آزادانہ آمد و رفت پر معترض نہ ہوں۔
 تب ایک دن اس نے جی کڑا کر کے کوئل سے پوچھ ہی لیا۔
 ”با جی! ایک بات پوچھوں۔؟ ٹھیک ٹھیک جواب دینے کا وعدہ کیجئے۔“
 ”وہ۔ تو میں پہلے کیا ہمیشہ تم سے جھوٹ بولتی رہتی ہوں۔؟“
 کوئل نے مسکراہٹ کو مونٹوں میں دباتے ہوئے مصنوعی غصے کا اظہار کیا۔
 ”ارے با جی! ناراض کیوں ہوتی ہیں۔؟ میں پوچھنا یہ چاہتا تھا کہ میں آپ کے پاس ہر روز ہی آتا ہوں۔ اور کئی کئی گھنٹے یہاں بیٹھا رہتا ہوں۔؟“
 ”تو کیا ہوا۔؟“

”میرا مطلب ہے کہ آپ کے والدین کو اس پر کوئی اعتراض تو نہ ہوگا۔؟“
 ”کیوں۔؟ تم شریف آدمی نہیں ہو۔؟“
 کوئل شوخی سے بولی۔
 ”نہیں نہیں۔؟ وہ گڑبڑا گیا۔“
 ”کیا۔؟ نہیں ہو۔؟“
 کوئل بدستور شرارت پر آمادہ رہی۔
 ”اوہ نہیں۔ آپ تو مذاق کرنے لگیں۔؟“
 وہ خفیف سا ہو گیا۔

اور اس کی حالت دیکھ کر کوئل کو اس پر ترس آ گیا۔ بے چارہ مناسا لڑکا۔! اسے اپنے بڑے بہن کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ تب وہ ذرا سنجیدگی اور پیار سے بولی۔

”تم میرے والدین کو نہیں جانتے۔ انہوں نے ہم دونوں بہنوں کی تربیت پر بڑی محنت کی ہے۔ اسی لیے ان کو ہم پر مکمل اعتماد ہے۔ تم فریج کے بھی دوست ہو اور میرے بھی۔ اور ان کی نظروں میں تمہارا وہی مقام ہے جو ہماری کسی سہیلی کا ہو سکتا ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں تم میری سہیلی ہو۔ ٹھیک ہے؟“
 کوئل نے ضرورت سے زیادہ بات کھول کر اس کی تسلی کر دینا چاہی۔
 ”جی ہاں۔ مگر کئی دن سے مجھے یہ خیال بہت بے چین کیے ہوئے تھا کہ کہیں میری وجہ سے آپ کے والدین آپ سے ناراض نہ ہوں۔“
 ”اچھا فرض کرو۔“

کوئل کی آنکھوں میں پھر شوخی بھرے ستارے چمکے۔
 ”اگر میں یہ کہہ دوں کہ ہاں میرے والدین کو تمہارے ساتھ میرا میل جول پسند نہیں تو۔ تم کیا کرو گے۔؟“
 ”تو میں کیا کروں گا۔؟“
 وہ سوچ میں پڑ گیا۔

”تو آپ سے خط و کتابت کر لوں گا۔ پھر کبھی کسی ہوٹل میں بلا لوں گا۔ کبھی سینما ہال میں مل لوں گا۔ کبھی کسی پارک میں۔ یونیورسٹی میں فریج کے بہانے لیکن یہ یقینی امر ہے کہ آپ سے ملوں گا ضرور۔ بے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔“

اتنا کہہ کر وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

”کس سوچ میں پڑ گئے عدیل؟“

”کول بھی کچھ ایسی اس کی ہر وقت کی باتوں کی عادی ہو چکی تھی کہ وہ موجود ہوتا تو لمحے کی خاموشی بھی اسے ڈس لیتی۔“

”کول کے مخاطب کرنے پر وہ چونک پڑا۔“

”نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں۔ ویسے باجی! ایک بات تو بتائیے۔ جب سے میں نے آپ کو دیکھا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں آپ کو بہت عرصہ سے جانتا ہوں۔ کئی صدیوں سے۔! جیسے ہزاروں سالوں سے ہم ہر جہم میں ایک دوسرے کے قریب رہے ہیں۔“

وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ نگاہیں دور کہیں جمی تھیں۔

”کبھی کسی وحشی قبیلے کے دو افراد کے رُوب میں۔ جب ہم علی الصبح شکار کھیلنے نکل جایا کرتے تھے۔ جنگل میں دن بھر جنگلی پھل کھاتے۔ پیتے چشموں ندیوں کا اوک سے پانی پیتے اور شام کو سب سے زیادہ شکار مار کر لاتے۔ ہم دونوں۔ دوسا تھی۔“

وہ سوچوں میں کھویا بولے جا رہا تھا اور کول اس کے سنجیدہ چہرے کو چُپ چاپ تنکے جا رہی تھی۔

”پھر اگلے جنم میں۔ شاید ہم کسی مندر میں بھگوان کے پجاری تھے۔ تنک لگاتے۔ گیروان لباس پہنے۔ ہم ہر صبح بھگوان کی مورتی کو پر نام کرتے۔ اسے گنگا جل سے اُشان دیتے۔ اس کے چرنوں میں پھول چڑھاتے۔ اُتھا ٹیکتے۔“

اس کے بھجن گاتے۔ میں اور آپ۔“

وہ جو معصوم اور سادہ سا تھا۔ اس وقت موبخو ڈارو کے کھنڈرات سے نکل کر آنے والی کوئی روح معلوم ہو رہا تھا۔ کول متعجب تھی۔

”اور اس سے اگلے جنم میں۔ شاید ہم دونوں سپاہی بن گئے۔ میدان جنگ میں پہلو بہ پہلو لڑتے ہوئے یکا یک میرے پہلو میں ایک تیرا کر لگا۔ آپ نے مجھے سہارا دیا اور پھر میدان جنگ سے دُور لے گئیں۔ تیر کو کھینچ کر نکالا۔ زخم پر مرہم رکھا۔ میں پیاس کی شدت سے کرا رہا۔“

”پانی۔ پانی۔“

اور آپ نے اپنی چھاگل سے میرے خشک ہونٹوں میں پانی پڑکا دیا۔

”باجی! یہ سب کچھ مجھے کیوں محسوس ہوتا ہے۔ بتائیے نا باجی کیوں؟“

کول خاموش تھی سوچوں میں کھوی ہوئی تھی۔

”کیا یہ سچ ہو سکتا ہے۔ کیا آواگون کا نظریہ ٹھیک ہے باجی! کیا آپ اس پر اعتقاد رکھتی ہیں۔؟“

وہ اتنا سنجیدہ تھا۔ یوں جیسے ہر لفظ جو اس کے ہونٹوں سے نکل رہا تھا حقیقت پر مبنی تھا۔ محض تصورات ہی نہیں۔! صرف مجذوب کی بڑ ہی نہیں۔!۔

خود اسے عدیل بہت اچھا لگتا تھا۔ اتنا کہ جیسے واقعی ماضی میں اس کے ساتھ اس کا کوئی تعلق رہا تھا۔

لمحہ بھر کے لیے وہ بھی عدیل ہی کی سوچ کی راہ پر چل پڑی۔ اسی سنجیدگی کے ساتھ۔!

”یہ روحوں کے مسائل ہیں عدیل۔!“
اور تب وہ بھی اسی انداز میں بولنے لگی۔ کھوئی کھوئی سی۔ مرنے والا رو کے
کھنڈرات سے آئی ہوئی دوسری روح کی طرح۔!

”اور ہمارے فانی اور محدود سمجھ رکھنے والے دماغ ان کی گہرائی کو نہیں ناپ
سکتے۔ شاید یہ درست ہی ہو۔ مگر یقین سے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیا پتہ ہم اس
سے پہلے واقعی کسی جنم میں بل چکے ہوں۔ اور آئندہ بھی جب کسی جنم میں اکٹھے
ہوں تو یہی سوچتے رہیں کہ کیا ہم اس سے پہلے کبھی آپس میں بل چکے ہیں۔؟“
اور آخر میں وہ ڈوبی ڈوبی ابھری۔ تو۔ یکایک اس کے حلق سے قہقہہ چھوٹ

پڑا۔

”تم تو پاگل تھے ہی۔ ساتھ میں بھی پاگل ہو گئی۔“
عدیل چونکا۔ اور اب کوئل کی ہنسی میں اس کی ہنسی بھی شامل تھی۔
”اچھا ہی ہے جو دونوں ہی پاگل ہیں۔ ورنہ پھر گزارہ نہ ہوتا۔“
عدیل نے کوئل کے پاگل پن کو بھی بڑی عقیدت اور احترام سے گویا
قبول کر لیا۔

فریج کی کلاس آرٹس کونسل میں ریڈ کر اس کے چندے کے لیے ڈرامہ کر
رہی تھی۔ کوئی کلاسیک قسم کی چیز تھی۔ بڑا زور شور تھا۔ انتہائی دھوم دھام تھی۔
صرف ایک دن کے لیے انہیں ال مل سکا تھا۔ لوگوں نے یہ سنا تو کٹھیں بلیک
ہونے لگیں۔ پانچ پانچ روپے والی ٹکٹ پندرہ پندرہ روپے میں بکی۔
چندے کی غرض سے نہیں۔ صرف اس لیے کہ کلاسیک قسم کے ڈرامے وغیرہ
دیکھنے کا ذوق رکھنے والا ہر فرد ماڈرن اور اونچے طبقے سے تعلق رکھنے والا سمجھا
جاتا ہے۔

تین دن پہلے سے فریج کوئل کو ساتھ چلنے پر مجبور کر رہی تھی۔ مگر وہ کسی
طرح مان ہی نہیں رہی تھی۔

آخر جس دن ڈرامہ تھا۔ تیار ہو کر جانے سے پہلے فریج نے ایک بار پھر اسے

ساتھ چلنے کو کہا۔ اور اب جب اس نے انکار کیا تو فریجہ نے اُجھ کر جھنجھلا کر طعن دے دیا کہ وہ شاید چندہ نہیں دینا چاہتی تھی۔ تو کوئی بات نہیں تھی اس کی ٹکٹ بھی وہ فریجہ نے کو تیار تھی۔

کوئل مسکرا پڑی۔ چپکے سے جا کر ایک ٹکٹ کے بجائے دو ٹکٹ کے پیسے لاکر اس کے ہاتھ پر رکھ دیتے۔

”ضروری نہیں کہ قیمت وصول کر کے کچھ خیرات کی جائے۔ یوں ثواب بھی نہیں ملتا۔“

فریجہ خفیف سی ہو کر رہ گئی۔

”وہ تو باجی! میں یہ سب صرف آپ کو ڈرامہ دکھانے کے لیے کہہ رہی تھی“

”کیوں آخر؟ ڈرامہ دکھانے پر تم اتنی مصر کیوں ہو؟“

”اس میں میں نے بھی کام کیا ہوا ہے۔“

سُر جھکا کر وہ مدھم سے لہجے میں بولی۔

”تم نے بھی؟“

کوئل تعجب سے چیخ سی پڑی۔

”امی! آپ سے پوچھا تھا۔“

”نیک کام! نیک مقصد کے لیے کیا ہے باجی! پھر بھلا اتنی اور آپا کو اعتراض کیوں ہونے لگا۔“

”لیکن۔ یوں اپنی تائش کر کے کچھ کماد دینا یا خیرات کرنا بھی تو جائز نہیں۔“

جابر نے نہیں۔

”باجی! جوں جوں زمانہ آگے جا رہا ہے آپ پیچھے چل رہی ہیں۔ لہذا اتنی دقتاؤس نہ ہو جائیے کہ۔۔۔“

”اچھا! کوئل نے بے کلی سے اس کی بات کاٹ دی۔

”تم جاؤ۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔“

”لیجیے۔ یہ دو ٹکٹوں کے پیسے۔ واپس لے لیجیے۔“

فریجہ روٹھی روٹھی سی بولی۔

”یہ تو پہلے ہی میں نے دینا تھے۔“

”اور ڈرامہ۔“

”میں نے اپنا ثواب ضائع نہیں کر لینا۔ بغیر معاوضہ کے میں امداد دینا چاہتی ہوں۔“

”آپ کی منطق بھی بس نرمالی ہی ہوتی ہے۔“

دونوں نوٹوں کو مٹھی میں دبا، وہ بڑبڑاتے بڑبڑاتے چلی گئی۔

”جائے آپ دن بدن بوڑھی مولواؤں کیوں بنتی جا رہی ہیں عجیب عجیب سی کہانیاں پڑھتی ہیں۔ عجیب و غریب ان کا فلسفہ ہوتا ہے۔“

سیر حیاں اترنے تک اس کی بڑبڑاہٹ کوئل کو سنائی دیتی رہی۔ کوئل ہلے ہوئے مسکراتی رہی۔ یہ اس کی عادت تھی۔ کوئی اسے بُرا بھلا بھی کہہ ڈالے تو جواب میں وہ مسکراتی رہتی۔ اور فریجہ تو اس کی نگاہ میں ابھی بچہ تھی۔ اور یہ سب کچھ اس کی محبت میں وہ کہہ رہی تھی۔

”لیکن۔ یوں اپنی تائش کر کے کچھ کماد دینا یا خیرات کرنا بھی تو جائز نہیں۔“

جابر نے نہیں۔

اس نے بھی تو اس کی اتنی التجاؤں اور منتوں کی پرواہ نہیں کی تھی۔
لیکن۔ وہ آخر کرتی بھی کیا۔؟
کچھ تو اپنے اصول اپنے خیال سے وہ ہٹنا نہیں چاہتی تھی کہ یوں رقم اکٹھی ہو تو جاتی تھی مگر دینے والے کو عاقبت کے لیے کچھ وصول نہیں ہوتا تھا۔ اور بھی بہت طریقے تھے۔ جن سے چندہ اکٹھا کیا جاسکتا تھا۔
اس بنیادی اختلاف کی وجہ سے وہ اگر ڈرامہ دیکھنے نہیں گئی تھی تو ایک اور بھی وجہ تھی۔

جانے کیوں ایسی محفلوں میں اور ایسی جگہوں پر جانے سے وہ اکثر گریز کرتی تھی۔ جہاں نوجوان لڑکے لڑکیوں کو اکٹھا ہونے کا موقع ملے۔
جوانی کی اس عمر کی جو فطرت ہوتی ہے۔ وہ اس سے اچھی طرح واقف تھی۔ لڑکیوں کا سچ بن کر آنا۔ بات بے بات شرماتا بچانا۔ ناز و انداز دکھانا۔ اور لڑکوں کا پروانوں کی طرح ان کے گرد چکر کاٹنا۔

یہ سب اسے ذرا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اپنے مذہب اور مذہب کی قدریں سے اسے بہت پیار تھا۔ اپنا ملک اور ملک کی قدریں اسے بے حد پسند تھیں اور وہاں۔ آج کل کے دور میں۔ اسے سب کچھ لٹا ٹٹا دکھائی دیتا تھا۔ لڑکیاں نئے نئے فیشن لگا کر اور نیم عریاں لباس زیب تن کر کے جب لڑکوں کو ترپانے ترسانے کے لیے ان کے قریب قریب سے خواہ مخواہ ہی گزرتیں۔ تو۔

اسے اپنی جنس سے نفرت سی محسوس ہونے لگتی کہ وہ بھی انہیں میں سے

تھی۔ یا۔ وہ اس میں سے تھیں۔! کیا فرق تھا اس میں اور دوسری لڑکیوں میں۔! اور پھر۔ سامنے تو نہیں البتہ پیٹھ پیچھے لڑکے جو جو باتیں بناتے ان سے بھی وہ واقف تھی۔ سامنے تو وہ پروانوں کی طرح مرٹنے، جل مرنے کو تیار نظر آتے مگر بعد میں اسی حسن کا جب بد صورتی کے انداز میں تذکرہ ہوتا۔ ایک ایک کا مذاق اڑایا جاتا تو اسے بہت صدمہ پہنچتا۔

اس لیے یہ سب اس کی برداشت سے باہر تھا۔ اس کے جانے کے بعد کافی دیر وہ خیالوں میں کھوتی بیٹھی رہی۔ فریج کے بھی وہی طور اطوار تھے۔ جو آج کل کی اکثر لڑکیاں اپنا چکی تھیں۔ کتنا چُست اور بھر پور کیلا سا لباس پہن کر وہ گئی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہر غلط نگاہ اُسی پر اٹھ رہی تھی۔

گو اسے اس پر اپنی بہن پر پورا اعتماد تھا مگر یوں بے حجابانہ لڑکوں میں جانے کا یہ انداز بھی پسند نہ تھا۔ جب بڑی دیر سوچ سوچ کر کوئی حل نہ سوچھا تو سر جھٹک کر اٹھی۔

ابا جو بہت روشن خیال تھے۔ ان کی دی ہوئی آزادی کی مخالفت کرنے کی اس میں جرأت کب تھی۔؟

پھر بھلا وہ کاہے کو مفت میں سر کھپاتی پھرتی بہت دنوں سے ایک میز لپش کاڑھنا شروع کیا ہوا تھا۔ روز ہی عدیل آجاتا تھا۔ پھر باتوں میں لگ کر وہ کام ہی نہیں کر سکتی تھی۔

وہ جلد جلد ہاتھ پلانے لگی۔
 صرف تین پتیاں ابھی کاڑھی تھیں کہ سیڑھیوں میں کسی کے قدموں کی چپ
 سنائی دی۔
 آواز مانوس تھی۔ پہلے ہی فریم پر سے ڈال دیا کہ اس نے اتنے ہی چین کر
 دور پھینک دینا تھا۔
 عدیل مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوا۔
 ”ارے! آج تو ڈرامہ تھا۔ تم نہیں گئے۔؟“
 کول نے حیرانگی سے پوچھا۔
 ”نہ ہم ایکٹریں نہ ڈائریکٹر۔ پھر کس لیے جاتے۔؟“
 ”ناظرین میں سے تو یقیناً ہو گئے نا۔؟“
 ”اور جو دوسرے بہت سے ہیں۔ پھر ہم اپنی شام کیوں ضائع کرتے؟“
 اس نے بڑھ کر کول کا ہاتھ تھام لیا۔
 ”ذرا اٹھ کر دیکھیے کس قدر حسین موسم ہے۔ میں نے سوچا کہ ڈرامے
 تو آئے دن ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ایسی شام نہ جانے دوبارہ کب آئے۔؟“
 وہ بے حد مسرور تھا۔ یوں۔ کھانے کیا پالیا تھا۔!
 ”اور آج میں ابا کی کار بھی لے آیا ہوں۔ چوری سے۔!“
 ”تو چوری کی ہے۔؟“
 کول نے گھور کر اسے دیکھا۔
 ”والدین کی چوری جائز ہوتی ہے۔ آبا ذرا سخت ہیں۔ لیکن امی سے یوچھ

لیا تھا۔ اٹھیے چلیں کوئی فلم دیکھتے ہیں۔“
 کول ٹھٹھا اڑانے کے انداز میں زور سے تنہی۔
 ”مہوں۔ تو جناب ابھی شام کسی سنیما ہال میں بیٹھ کر گزار دینا چاہتے ہیں
 پاگل۔! تمہیں کیا لطف آئے گا اس حسین شام کا۔ اندھیرا اور ایر کنڈیشنڈ
 سنیما ہال۔“
 ”اچھا بابا! فلم نہیں دیکھتے۔ جہاں آپ کہیں گی وہیں چلے چلیں گے۔ اٹھیے
 تو سہی۔ مجھے تو سرور کا صرف آپ کے ساتھ سے ہے۔ آپ ساتھ ہوں گی تو۔“
 ”مجھے تو معاف ہی رکھو۔ بڑا ضروری کام کر رہی ہوں۔“
 ”نہیں نہیں۔ بہانہ کوئی نہیں چلے گا۔“
 ”نہیں سچی۔ بہانہ نہیں۔“
 ”تو حقیقت بھی کوئی نہیں۔ اتنے خلوص اور شوق سے میں نے آپ کی
 خاطر چوری کی ہے۔“
 ”واہ، واہ۔! کیا کہنے۔ خلوص اور شوق سے چوری۔“
 کول مسکراتی۔
 ”پلیز اٹھیے۔ میرے پاس وقت کم ہے۔“
 اور اس نے کول کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور کھینچ کر ڈریسنگ روم کی
 طرف دھکیل دیا۔
 ”بڑے زبردست ہو۔“
 ”مرد جو ہوں۔“

”اپنے مرد ہونے کا رعب مجھ پر مت ڈالا کرو۔ میں عمر میں تم سے بڑی ہوں۔“

”آپ بھی عمر کی بڑائی کا طعن مجھے مت دیا کیجئے۔ عورت کے ناموس کی حفاظت بڑی بہادری سے کر سکتا ہوں۔ میرے بازوؤں کی طاقت دیکھئے میرا قد اور جسم دیکھیے۔ میرے سامنے آپ منی سی لگتی ہیں۔“

”اچھا اچھا۔ شیخی مت مارو۔“

”اور اب آپ برائے مہربانی! میرے وقت کا اس بے دردی سے خون مت کیجیے۔“

وہ باتیں کیے جا رہی تھیں۔ عدیل نے آگے بڑھ کر اسے ڈرینگ روم کے بالکل اندر دھکیل دیا۔ اور خود واپس آکر اس کی جگہ پر بیٹھ گیا۔

قریب ہی اس کا کشیدے والا فریم پڑا ہوا تھا۔ اٹھا کر اس کے کارٹھے ہوئے پھول اور پتیاں دیکھنے لگا کسی انسانی ہاتھ کا کام تو لگتا ہی نہیں تھا۔ ایسا صاف سُتھرا بے داغ جیسے مشین سے کارٹھا گیا تھا۔

وہ سوچوں میں کھو گیا۔

وہ ہر لحاظ میں برتر تھی باہر معاملے میں بلند۔!! ہر کام میں لاثانی۔!!!

”با جی! آخر تم کیا ہو۔؟“

”چلو بھئی۔“

کول کی آواز پر اس نے سر اٹھایا۔

”اوتے ہوئے۔!“

اس نے جلدی سے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیے۔

”کیا ہوا عدیل۔؟“

کول گھبرا کر اس کے قریب آگئی۔

”کچھ نہیں با جی! آپ کو دیکھ کر آنکھیں خیر ہو گئی تھیں۔ بخدا اس نیلی ساڑھی میں آپ کس قدر سمارٹ اور خوبصورت۔۔۔“

”اچھا اب زیادہ باتیں نہ بناؤ! کول نے شرما کر اس کی بات کاٹ دی۔

”چلو اٹھو۔ ابھی مجھے اتنی سے اجازت بھی لینا ہے۔ پھر کہو گے کہ تمہارے وقت کا خون کر رہی ہوں۔“

”ا جی وقت کو چھوڑیے۔ اب تو اپنا ہو گیا۔“

بڑے غور سے اور بڑی گہری گہری نگاہوں سے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے وہ اس کے ساتھ چل پڑا۔

اتنی سے اجازت ملنا کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔ انہوں نے کبھی اسے کسی بات سے روکا تو گمانہ تھا کہ اس پر اتنا مکمل انہیں اعتماد تھا۔

کار میں بیٹھنے کے لیے کول نے پچھلا دروازہ کھولا تو عدیل اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے غصیلے لہجے میں غرایا۔

”کمال کرتی ہیں آپ بھی۔ اتنی ہی بے اعتمادی تھی تو میرے ساتھ آئی ہی کیوں تھیں۔؟“

”پاگل! یہ بے اعتمادی کیسی۔؟“

”پھر۔؟“

اس نے جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
 ”پھر لمبی ڈرائیو پر چلیں گے۔ کسی طرف۔“
 وہ جیسے ترنگ میں آکر بولا۔

”بہت لمبی ڈرائیو۔ اور آپ ساتھ ساتھ کوئی اچھی سی، پیاری سی، بالکل
 اپنے جیسی غزل سنائیے گا۔ اسی خوبصورت اور مست کر دینے والے ترنم کے
 ساتھ۔“

شام کا ملگجاسا اندھیرا ہر طرف پھیل رہا تھا اور وہ دونوں آئس کریم کھانے
 کے بعد باغ جناح میں ٹہل رہے تھے۔ اور مزے مزے کی باتیں کیے جا رہے تھے
 ارد گرد سبز ہی سبز تھا۔ پھول ہی پھول تھے۔ ان کی معطر خوشبو دل
 دماغ کو مست کیے دے رہی تھی۔

”باجی! ایک سوال پوچھوں۔؟“
 عدیل یکدم رک کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔
 ”تم ہر وقت کچھ نہ کچھ پوچھتے ہی رہتے ہو۔“
 عدیل مسکرائی۔

”پوچھو۔ کیا پوچھنا چاہتے ہو۔؟“
 عدیل کچھ خاموش سا ہو گیا۔ پھر قدرے توقف اور ذرا سی ہچکچاہٹ کے
 بعد بولا۔

”باجی! سوال کچھ ذاتی ہے۔ مگر بحیثیت ایک دوست کے شاید مجھے پوچھنے
 کا حق بنتا ہے۔ یہ بتائیے کہ آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی۔؟“

”صرف دنیا کے خیال سے کہ۔“
 ”اور دوستی گئی ہنرمیں۔“

”تو بہ باتم تو بات کا بتکڑ بنا دیتے ہو۔“
 ”تو آپ مجھے ستانی کیوں ہیں۔؟“

اس نے اٹلا دروازہ کھول کر کول کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ چپ چاپ
 بیٹھ گئی۔

خود ڈرائیو تک سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اسی معصومیت اور زندہ دلی سے
 عدیل بولا۔

”فلم کا پروگرام آپ نے کنسل کر دیا۔ لہذا اب دوسرا پروگرام بنانا آپ
 کے ذمہ۔ بتائیے کہاں چلیے گا۔؟“
 ”صاف ظاہر ہے پہلے آئس کریم کھانے چلیں گے۔“

کول مسکرائی۔
 ”اس کے بعد کچھ دیر جناح پارک میں ٹہلیں گے۔ پھر جب مزے آئس کریم
 کی ٹھنڈک ختم ہو جائے گی تو پھر چائے پیئیں گے۔“
 ”کہاں۔؟“

”یہ تمہاری چوائس۔!“

”اور اس کے بعد۔؟“

”جہاں تم چاہو لے چلتا۔“

”دیری گڈ۔! ایک اچھے دوست کی طرح آپ اب بات کر رہی ہیں نا!“

”کیا مطلب ہے؟“

”دیکھیے۔ آپ کی عمر اس وقت کتنی ہے؟“

”یہی کوئی پچیس پچیس سال کے لگ بھگ۔ مگر بے وقوف لڑکے! نہیں آج تک کسی نے یہ بھی نہیں بتایا کہ لڑکیوں سے ان کی عمر نہیں پوچھا کرتے“

”کول بڑے انداز سے مسکرائی۔“

”اور یہ بھی یاد رکھو کہ وہ کبھی اپنی صحیح عمر بتاتی بھی نہیں۔“

”پھر آپ نے کہیں اپنی صحیح عمر نو مجھے نہیں بتادی؟“

”عدیل شوخی سے ہنسا۔“

”میں شاید حوا کی پہلی بیٹی ہوں جس نے اپنی صحیح عمر ایک مرد کو بتاتی ہے۔“

”مجھے اس پر فخر ہے۔“

”وہ ذرا سا جھکا۔ پھر مسکرایا۔“

”لیکن میرے سوال کا جواب ابھی آپ نے نہیں دیا۔ دیکھیے نا آپ نے

چھ سال پہلے بی اے کیا تھا۔ اس کے بعد آپ نے مزید پڑھنے سے انکار کر دیا۔

اس وجہ سے کہ یہ خالی خولی پڑھائی آپ کی ذہنی تشنگی کو نہیں مٹا سکتی۔“

”کول بڑے تعجب سے اسے دیکھ رہی تھی۔“

”حیران نہ ہوئیے۔ یہ سب باتیں مجھے فریخہ کی زبانی معلوم ہوئی ہیں۔ تو

آپ نے یہ اتنے سال کیوں بے کار ہی گزار دیئے۔ کہیں شادی دیری کر کے

مزے کی زندگی گزاریں؟“

”لیکن اگر شادی کر لیتی تو پھر تم سے کیسے ملتی ہے؟“

”کول نے بات مذاق میں ٹالنا چاہی۔“

”مذاق چھوڑیئے۔ جنہیں ملنا ہوتا ہے وہ مل ہی جاتے ہیں۔ آپ میری

بات کا جواب دیجئے۔“

”کول خاموشی سے کچھ سوچنے لگی۔“

”بتاؤں میرا کیا خیال ہے؟“

”عدیل پھر بولا۔“

”آپ نے اس لیے اب تک شادی نہیں کی کہ آپ کو ابھی تک اپنا

آئیڈیل نہیں ملا۔“

”ارے بچکے۔! آئیڈیل بھی کبھی ملا کرتے ہیں۔؟“

”اندھیرا ہونے کی وجہ سے وہ کول کے چہرے کے تاثرات تو نہ دیکھ سکا،

البتہ لہجے میں چھپی ہوئی جواں فردگی مٹتی وہ اس سے چھپی نہ رہ سکی۔“

”اور یہی نقطہ میں آپ کو سمجھانا چاہتا تھا کہ باجی! آئیڈیل کبھی نہیں ملا

کرتے۔ ان کا انتظار بے کار ہے۔ اس لیے اب آپ کسی اوسط درجے کے انسان

سے شادی کر ہی ڈالیے۔ اگرچہ مجھے یقین ہے کہ اس دنیا میں ایسا انسان شاید ہی

کوئی ہو۔ جو آپ کا خاوند بننے کا اہل ہو۔“

”چلو چھوڑو ان باتوں کو۔ آؤ چلیں۔ ابھی ہمارے پروگرام کا بہت سا حصہ باقی

ہے۔ اور رات سر پر آگئی ہے۔“

”عدیل نے مزید کچھ نہیں پوچھا۔ چپ چاپ کول کا ہاتھ تھام لیا۔“

”اؤ دوست۔! چائے ہمارا انتظار کر رہی ہوگی۔“ مسکراتے ہوئے اس نے قدم بڑھائے۔“

”آندھی طوفان کی طرح جو آتے ہو۔ اور طوفانوں کا عادی انسان مشکل سے ہو پاتا ہے۔“
 کوئل مسکرائی۔
 ”تو میں ایسی دہشتناک چیز ہوں۔؟“
 شکوے کے طور پر وہ پوچھنے لگا۔
 ”لگتا تو ایسا ہی ہے۔“
 کوئل مسکراتی رہی۔
 ”تبھی۔!“

”تبھی کیا۔؟“
 ”وہ آپ کی بہن بھی ہیں منہ نہیں لگاتی۔“
 ”کیا مطلب۔؟“
 ”فریجہ کیا کچھ ناراض ہے ہم سے۔؟“
 ”نہیں تو؟“

”مجھے تو وہ بہت غصے میں لگ رہی تھی۔ آج یونیورسٹی میں اس نے سارا دن مجھ سے بات نہیں کی۔ میں نے بلانے کی بہتری کوشش کی مگر۔۔۔“
 ”وہ ذہنی طور پر ابھی ناچختہ ہے۔“

کوئل اس کی بات قطع کرتے ہوئے جلدی سے بہن کی صفائی میں بولی۔
 ”بچوں کی طرح وہ اب بھی بات بات پر روٹھ جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے تم نے ادائیگی میں کوئی ایسی بات کہہ دی ہو۔“

”اسلام علیکم۔!“
 ”وعلیکم السلام۔!!“
 اپنے خیالوں سے چونکنے کے باوجود اسے سلام کا جواب دینا نہیں بھولی تھی۔
 معمول کے مطابق عدیل نے اس کے ہاتھ سے اسٹائل اور دھاگے کا گولہ چھین کر پرے پھینک دیا۔
 ”میں جب آجایا کروں تو حیران ہو ہو کر مجھے دیکھنے کے بجائے ان خرافات کو علیحدہ ہٹا دیا کریں۔“
 اس کے قریب بیٹھ کر پھر وہ مسکرایا۔
 ”ابھی تک آپ میری عادی نہیں ہوئیں شاید۔ کہ میری آمد چند لمحوں کے لیے آپ کو ضرور حیران پریشان کر دیتی ہے۔“

”مجھے تو کوئی ایسی بات یاد نہیں۔ اہا کہیں وہ اس وجہ سے ناراض تو نہیں کہ کل ہم اسے ساتھ لیے بغیر ہی سیر کو چلے گئے تھے۔؟“
عدیل متفکر سا ہو کر پوچھ رہا تھا۔ کوئل اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے جلدی سے بولی۔

”نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کل جب ہم گئے تھے تو وہ یہاں نہیں تھی۔“
عدیل کو تو یہ کہہ کر اس نے ٹال دیا مگر معاً اسے یاد آیا۔ رات جب وہ ساڑھے نو کے قریب واپس پہنچے تھے تو عدیل باہر ہی اسے اتار کر خود اپنے گھر بلا گیا تھا۔
کوئل اوپر آئی تو دیکھا فریج ڈرامے سے واپس آچکی تھی۔ اسی وقت بالکنی سے کمرے کے اندر داخل ہوئی تھی۔

شاید عدیل کو اور اسے اکٹھے آتے دیکھ لیا تھا۔ موڈ بڑا خراب ہو رہا تھا۔
کوئل نے ہمیشہ کی سی سادگی اور خلوص سے ڈرامے کے متعلق اس سے پوچھا تو وہ سیدھے منہ بات کیے بغیر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔
شاید فری کو ان دونوں کا اکٹھے جانا کچھ اچھا نہیں لگا تھا۔ لمحہ بھر کے لیے اس وقت بھی کوئل کو یہ خیال آیا تھا۔

مگر۔ اپنی صاف دلی کی وجہ سے وہ اپنے اس خیال کو زیادہ دیر کے لیے دل میں جکڑ نہ دے سکی۔

”کیا سوچ رہی ہیں۔؟“
عدیل کی نگاہیں غور و فکر میں ڈوبے اس کے خوبصورت چہرے پر گڑی تھیں۔
”نہیں۔ کچھ نہیں۔“

کوئی ایسا اچھا خیال نہیں تھا کہ وہ عدیل پر بھی ظاہر کر دیتی۔
وہ کیا سوچے گا۔؟ کہ کیسی لپست ذہنیت تھی فریج کی۔!
اور۔ فریج اس کی حقیقی اور بے حد پیاری بہن تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے مزاج یا طبیعت کی کوئی خامی کسی اور پر کھلے۔

”ارے اہا باجی! میں جس لیے یہاں آیا تھا وہ تو بھول ہی چلا تھا۔“
”کیا۔؟“

”آج آپ میرے ساتھ میرے گھر چل رہی ہیں۔“
”لیکن۔۔۔“

”دیکھیے دیکھیے۔ آپ انکار کرنے کی کوشش نہ کیجیے گا۔ میں آج آپ کو اپنے گھر لے جانے کا پکا ارادہ کر کے آیا ہوں۔ میری مردانگی کو بھی چیلنج نہ کیجیے گا ورنہ اٹھا کر بھی لے جاؤں گا۔“

”کچھ سوچو تو فری بھی اپنی سہیلی کے گھر گئی ہوئی ہے۔ امی اکیلی رہ۔۔۔“

”اب کونسی آپ امی کو کہتی دے رہی ہیں۔“

اس کا کوئی بھی عذر سننے کو گویا وہ تیار نہ تھا۔

”دیکھیے نایہ کہاں کی شرافت ہے کہ میں یہاں روز بلا ناغہ آتا ہوں اور آپ کو ابھی تک میرے گھر کا بھی پتہ نہیں! اٹھ جائیے خود ہی۔ ورنہ اٹھانے لگا ہوں آپ کو۔“

وہ اتنا ہی زبردست تھا۔ جو بات من میں آ جاتی کر کے ہی چھوڑتا۔
اس کی دھمکی سننے ہی کوئل پیش بندی کے طور پر خود ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کمال ہے۔ ہمارے گھر کبھی چلتی نہیں اور میں روز آتا ہوں۔ پتہ نہیں کیا ہوں۔ پاگل ہوں۔ سر پھرا ہوں۔ مدیدہ ہوں۔“
وہ بڑبڑاتے جا رہا تھا۔

”دیکھو عدیل! اب زیادتی نہ کرتے جاؤ۔ یاد کرو۔ تم نے آج تک کبھی مجھے اپنے گھر چلنے کے لیے کہا بھی ہے۔؟“

اس کی بڑبڑاہٹ کا جواب کوئل نے شکایت سے دیا۔
”اچھا۔“ عدیل نے یکدم حیران ہوتے ہوئے کوئل کی آنکھوں میں بغور دیکھا۔
”تو آپ گویا ابھی اسی منزل پر ہیں کہ جب تک میں دعوت نہ دوں۔
آپ جائیں گی ہی نہیں۔ بخدا اگر آپ کی جگہ میں ہوتا اور آپ میری جگہ تو میں
آپ کے کان کھینچتا کہ تم ابھی تک مجھے اپنے گھر لے کر کیوں نہیں گئے۔“
”زبان سنبھال کر بات کرو۔ تم سے پورے پانچ سال بڑی ہوں۔“
کوئل نے بڑے رعب سے کہا۔

اور وہ۔ جب بھی اپنے بڑے پن کا اظہار کرتی تو عدیل کی حالت متغیر
سی ہو جایا کرتی تھی۔

”لیجیے۔“ وہ ذرا خفیف سا ہو گیا۔

”اس میں گستاخی کی کون سی بات ہے۔ پہلے آپ کو اپنی جگہ پر رکھا تو تب
کہیں آپ کے کان کھینچنے کا خیال دل میں لا سکا تھا۔ سمجھیے میں نے اپنے
ہی کان کھینچے ہیں۔“

پھر وہ چمک پڑا۔

”ارے! آپ مجھے باتوں میں لگا کر وقت ٹالنے کی کوشش کر رہی ہیں۔
تیار ہو جائیے نا جلدی سے۔“
”ضد کے بہت پکے ہو۔“
کوئل پیار سے اسے دیکھتے ہوئے تیار ہونے چلی گئی۔

کول کو گھر کیا لے آیا تھا جیسے کوئی راجہ مہاراجہ اس کے گھر اُپر ہمارے
تھے۔ جیسے اس کے پیرومرشد نے صرف اسے ہی یہ عزت بخشی تھی۔ وہ بوکھلایا
جا رہا تھا۔

”میں اپنے لیے جگہ کا انتخاب خود ہی کر لوں گی۔ تم جا کر اُمی کو تو بلاؤ۔“
کول مسکرا دی۔

”پگلا۔!“

کمرے میں لگی خوبصورت پینٹنگز ہی ابھی وہ دیکھ رہی تھی کہ عدیل اُمی کو
لے کر آگیا۔

”اُمی! یہ ہے میری باجی۔ اور باجی! جیسا کہ صاف ظاہر ہے یہ میری
اُمی ہیں۔“

اس نے تعارف کرایا۔

”پسند آئیں آپ کو۔؟“

”مشریہ!“

اُمی نے پیار سے اسے چپٹ لگائی۔

”ماں کو بھی مذاق کرنے سے نہیں چوکتا۔ اور بیٹی!“

پھر وہ کول سے مخاطب ہوئیں۔

”تم ابھی تک کھڑی ہو۔ آؤ بیٹھو۔ یہاں میرے پاس۔“

اُمی نے اسے اپنے پاس ہی صوفے پر بٹھالیا۔ عدیل نیچے قالین پر دونوں
کے قدموں میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

”اوہو۔! بڑا پیارا گھر ہے تمہارا۔“

کول نے ڈرائینگ روم میں داخل ہوتے ہوئے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔

”اجی یہ تو صرف آپ کا حسن نظر ہے۔“

عدیل جھکتے ہوئے بولا۔

”ورنہ ہم کیا اور ہماری ہستی کیا۔؟“

”یہ لکھنوی انداز تم نے کہاں سے سیکھے۔؟“

”بس ہے کسی کی پیاری سی صحبت کا اعجاز۔ کس کی۔؟ یہ پھر بتاؤں گا۔ پہلے

میں اُمی کو بلاؤں۔“

دو فور مسرت سے گویا اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹپک رہے تھے۔

”آپ یہاں تشریف رکھیے۔ نہیں یہاں۔ میرا خیال ہے یہ جگہ ٹھیک رہے گی۔“

”مجھے تم سے ملنے کا بہت ہی اشتیاق تھا۔ عدیل کی زبان پر ہر وقت تمہارا ہی ذکر رہتا ہے بیٹی۔ آخر میں نے کہا کہ مجھے بھی کسی دن اپنی باجی سے ملاؤ۔“

”جی ہاں اُمی۔! میں ذرا کم ہی کہیں آیا جایا کرتی ہوں۔“

”زہے نصیب کہ تم نے ہمارے گھر کو رونق بخشی۔“

اُمی بڑے پیار سے اس نازک سی، سندر سی لڑکی کو دیکھ رہی تھیں۔

”تم بیٹھو۔ میں ذرا خانساں کو چائے وغیرہ کا کہہ آؤں۔“

”جی نہیں اُمی۔! شکریہ۔ آپ تکلف نہ کریں۔ مجھے ذرا جلدی جانا ہے۔“

”نہیں اُمی۔ عدیل بیچ میں ہی بول پڑا۔“

”باجی غلط کہہ رہی ہیں۔ حالانکہ یہ راستے میں مجھے تاکید کرتی آئی تھیں کہ انہیں چائے بھی پلاؤں اور ساتھ بہت ساری چیزیں بھی کھلاؤں۔ اور انہیں واپس جانے کی بھی کوئی جلدی نہیں۔ مجھے کہہ رہی تھیں کہ جتنی دیر چاہے بیٹھائے رکھنا۔“

”تو بہ تو بہ عدیل! تم سا جھوٹا زمانے میں کوئی نہ ہو گا۔“

کومل محبوب سی ہو کر کبھی اس کی طرف اور کبھی اُمی کی طرف دیکھنے لگی۔

”بیٹی! یہ ہے ہی بڑا گپ باز۔! اُمی اٹھ پڑیں۔“

”بس میں ابھی آئی۔ ایک منٹ میں۔“

وہ کمرے سے باہر نکلیں تو عدیل نے جھٹ کومل کے پاؤں پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے۔

”آپ ناراض ہو گئیں۔؟“

”اُمی کیا سوچتی ہوں گی۔؟“

کومل نے پاؤں پر سے کھینچنا چاہے۔ عدیل نے گرفت مضبوط کر دی۔

”معاف کر دیجئے۔ میں تو آپ کے وجود سے اپنے گھر کو بہت ڈھیر سا ر وقت کے لیے مہکانا چاہتا تھا۔“

”کیا تک رہے ہو۔؟“

”وہ۔ میرا مطلب ہے۔ عدیل مسکرا اٹھا۔ پھر شکایت بھرے لہجے میں بولا۔

”میں آپ کو بہت ڈھیر سا ر وقت یہاں بیٹھانا چاہتا تھا۔ آپ نے بھلا چائے سے انکار کیوں کر دیا۔؟“

”تو پھر انسانوں کی طرح کہنا تھا نا۔ چھوڑو اب میرے پاؤں۔ جانے تمہارا بچپن کب جائے گا۔؟“

”آپ مجھے ہر وقت بچہ ہونے کا طعنہ نہ دیا کریں۔“

وہ یکدم تلخ ہو پڑا۔

”آئیے نا ذرا ناپ کر دیکھ لیتے ہیں۔ کون بڑا ہے اور کون چھوٹا۔!“

”اور تم بھی ہر وقت اپنے قد کا رعب نہ مجھ پر ڈالا کرو۔“

”تو پھر لائیے ہاتھ معاہدہ کریں۔۔۔“

اور جانے وہ کون سا معاہدہ اس کے ساتھ کرنے جا رہا تھا کہ اُمی چائے کا کہہ کر واپس آ گئیں۔

چائے کے ساتھ اُمی نے بہت ڈھیر ساری چیزیں منگوالی تھیں۔ کومل نے اتنا تکلف کرنے کا گلہ کیا تو اُمی نے بتایا کہ یہ سب تو عدیل کی خوشی تھی۔

اسے لے کر آنے سے پہلے وہ خود سب کچھ بازار سے لے کر آیا تھا۔ حالانکہ اُمّی نے جب کبھی کوئی سود یا ضروری چیز بازار سے لانے کو کہا تو ہزار عذر تراش دیا کرتا تھا۔

پھر جس طرح اور جس جس انداز میں وہ کوئل کا ذکر ہر وقت کرتا رہتا تھا اُمّی اسے وہ بتانے لگیں۔

ساتھ ساتھ چائے چلتی رہی۔ عدیل ہی بنا بنا کر دیتا رہا۔ اصرار کر کے، انتہائی زبردستی اس نے ڈھیر ساری چیزیں بھی اسے کھلا دیں۔ عجیب پاگل سا لڑکا تھا۔ مگر انتہائی دلچسپ۔ !!

اس کے علاوہ گھر کی ادھر ادھر کی بہت ساری باتیں اُمّی اور وہ کرتی رہیں۔ بیچ بیچ میں عدیل لقمے دینے سے باز نہیں آتا تھا۔ کبھی کوئی مذاق کی بات کر دیتا کبھی کوئی ہنسی کا پٹا فرچھوڑ دیتا۔

اُمّی کے انداز سے لگتا تھا کہ کوئل کی سحر کار شخصیت کے مقناطیس نے انہیں بھی اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔

ہر موضوع پر وہ اس وضاحت سے اور اس انداز سے بات کر رہی تھی کہ دوسرے کو اس کے سامنے اپنا آپ خود بخود ہی کم تر محسوس ہونے لگتا تھا۔ سیاست کے متعلق، اخلاقیات کے متعلق، فلسفہ اور حدیث کے متعلق اور سب سے زیادہ مذہب کے متعلق۔ ہر موضوع پر گویا اسے عبور حاصل تھا۔ اُمّی حیران ہوئی جا رہی تھیں کہ اس نا پختہ عمر میں وہ اتنے پختہ ذہن اور خیالات کی مالک تھی۔

عدیل مسکرا مسکرا کر اور بڑے تفاخر سے اُمّی کو دیکھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ”میں باجی کی غلط تعریفیں تو نہیں کیا کرتا تھا۔ دیکھ لیجیے۔ میری باجی ایسی ہی اعلیٰ اور عظیم ہیں۔“

آج اُمّی سے ہر موضوع پر جس فصاحت اور بلاغت سے اس کی گفتگو ہوئی تھی اس نے اسے مزید مرعوب کر دیا۔ اس کے خیالات کی وسعت کا تو اسے صحیح طرح آج اندازہ ہوا تھا۔ اور وہ۔ وہ تو پہلے ہی اس سے بہت متاثر تھا۔

اور پھر شام ڈھلے جب عدیل اسے واپس گھر چھوڑنے جا رہا تھا تو اسے اپنی زبان پر قابو ہی نہ رہا۔

”باجی! آپ کتنی عظیم ہیں۔ کتنی بلند اور عام انسانوں سے کتنی مختلف۔ لگتا ہے آپ کسی اور دنیا کی رہنے والی ہیں۔ اس دنیا کے لیے تو جیسے بنی ہی نہیں۔ آپ کی دنیا کے لوگ اس کرۂ ارض کے باسیوں سے بہت بلند ہیں۔ ہر لحاظ سے، ہر پہلو سے۔ جن کی زندگی کی قدریں دولت اور شہرت جیسی حقیر چیزوں کی بنیاد پر قائم نہیں کی گئیں۔“

دونوں نے پیدل ہی واپس جانے کا ارادہ کیا تھا۔ عدیل ساتھ ساتھ بولے جا رہا تھا اور کوئل چپ چاپ صرف مسکرا رہی تھی۔

”باجی! آپ نے کبھی راج ہنس کو تیرے دیکھا ہے۔ کیسے اپنی ہی شان میں مست گرد و پیش سے بے نیاز تیرا رہتا ہے۔ اس کی ہر حرکت میں ایک خاص ادا ہوتی ہے۔ ایک انوکھی شان۔ جس کا کوئی مثل نہیں۔“

کچھ ایسی ہی آپ کی ہستی ہے باجی! اور عام انسان آپ کے مقابلے میں ان چھوٹے چھوٹے پرندوں کی مانند ہیں جو کیچڑ میں ہی اچھل کود کر خوش ہو جاتے ہیں۔ ہم جیسے انسان!۔

کوئل نے کچھ کہنا چاہا۔ اسے خاموش کرانا چاہا کہ اتنی زیادہ تعریف اسے پریشان کیے دے رہی تھی۔ مگر عدیل نے کچھ سنا ہی نہیں۔

”باجی! آپ اس بلند و بالا درخت کی مانند ہیں جس کی چوٹی آسمانوں کو چھوتی ہے۔ بادلوں میں پوشیدہ ہے۔ جسے بڑے سے بڑا طوفان بھی ہلا نہیں سکتا۔ اس کی بلندی اور قامت میں جو شان ہے وہ کسی اور میں نہیں۔ اس کا حسن بے مثال ہے اور اس کا جمال لازوال!“

”عدیل سنو تو۔ توبہ توبہ۔ منہ میں زبان ہے یا قنچی!“

مگر وہ اپنی ہی کہے جا رہا تھا۔

”ہزاروں مسافر اس کی چھاؤں میں آرام کرتے ہیں۔ اور میں۔ میں آپ کے خوشہ چینوں میں سے ایک ہوں۔ میں آپ سے زندگی کے درس لوں گا۔ کہ آپ بہت عظیم ہیں اور بہت بلند۔“

بڑی عقیدت تھی اس کے الفاظ میں اور اس سے زیادہ اس کی نگاہوں میں۔ ”خدا اور رسول کے بعد میں آپ ہی کی عظمت کا قائل ہوں۔ گو اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ میں نے آپ میں کیا کیا خوبیاں دیکھی ہیں تو شاید مجھے کوئی جواب بن نہ پڑے۔ آپ کو بیان کرنے کے لیے ابھی الفاظ نہیں بنائے گئے۔ مگر پھر بھی آپ میں بہت کچھ ہے۔ میری فہم سے بھی بالاتر۔ کیا میں کبھی صحیح طرح آپ کی

عظمت کا اندازہ کر سکوں گا۔ کیا میں کبھی آپ کو سمجھ پاؤں گا۔ شاید کبھی نہیں۔ کبھی بھی نہیں۔“

وہ جیسے اپنے ہوش میں نہ تھا۔ ایک ٹمک کوئل کو دیکھے جا رہا تھا اور بوسے جا رہا تھا۔

”باجی! کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر میں آپ سے نہ ملا ہوتا تو میری زندگی کیا ہوتی؟ اس خیال سے بھی میں کانپ اٹھتا ہوں۔ باجی! جس طرح چاند اپنے نور کے لیے سورج کا مرہونِ منت ہے بالکل اسی طرح آپ کے خیالات نے میری زندگی، میرے ذہن کو منور کر دیا ہے۔ اگر میں آپ سے کبھی نہ ملتا تو میری زندگی کس قدر بے معنی، کھوکھلی اور تاریک ہوتی۔ اس کا اندازہ مجھے اب ہوا ہے باجی! اگر میں کبھی آپ کی عظمت کا اندازہ کر پاتا تو شاید میں آپ کو سجدہ کرنے پر مجبور ہو جاؤں۔“

”توبہ توبہ عدیل! کفر مت بکو۔“

کوئل نے گھبرا کر اس کے منہ پر اپنا نازک سا ہاتھ رکھ دیا۔ یہ سوچے سمجھے بنا کہ وہ چلتی سڑک پر تھے۔

”تم تو اپنے ساتھ مجھے بھی گناہ گار کر رہے ہو۔“

”توبہ نعوذ باللہ! آپ کو کیسے گناہ گار کر سکتا ہوں۔“

”تو اور کیا۔ میں خدا کا ایک معمولی سا انسان ہوں۔ اور تم نے مجھے جانے

کیا بنا دیا۔“

”میں نے نہیں بنایا میری باجی! صرف آپ جو کچھ ہیں اس کی تعریف کر رہا

ہوں۔ اور خدا کی تخلیق کی سچے دل سے تعریف کرنا بھی اک عبادت ہے۔

”تو گویا تمہاری عبادت ہو رہی تھی؟“

”کوئل زور سے ہنس دی۔“

”ایسا ہی سمجھ لیجیے۔“

”تو پھر پہلے نماز پڑھنا شروع کرو۔“

”آپ کا حکم؟“

”نہیں۔ خدا کا فرمان۔ میری صرف نصیحت۔!“

”مسرخم ہے۔ دعا کیجیے گا میرے لیے۔“

اور اس نے انتہائی خلوص و احترام سے کوئل کے ہاتھ تھام لیے۔

”بیعت کرتا ہوں آپ کے ہاتھ پر۔!“

اس نے گویا عقیدت کے اظہار کے طور پر انہیں چوم کر آنکھوں سے لگا لیا۔

”شیر!۔“

کوئل زور سے ہنس دی۔

”یہ باتیں بنانے میں تمہیں کمال حاصل ہے۔“

”ذرا نوازی ہے۔“ عدیل شوخی سے جھکا۔

”لو گھر بھی آگیا۔“

”اتنی جلد؟“

”میری ٹانگیں تھکن سے چور چور ہیں اور تم کہتے ہو کہ اتنی جلد۔!“

”آخر میں نانا زک سی لڑکی۔ اتنے سے ہی تھک گئیں۔ اور مجھے دیکھیے۔“

بغیر تکان محسوس کیے اس سے کئی گنا زیادہ فاصلہ اور طے کر سکتا ہوں۔“

”تو پھر مجھے تو یہاں چھوڑو اور خود اپنے اور میرے گھر کے دو تین چکر لگاؤ۔“

دیکھتے ہیں۔ تھکتے ہو یا نہیں۔؟“

”اکیلا تو شاید اب چند گز بھی نہ چل سکوں۔ یہ تو صرف آپ کی ہم سفری

کی برکت ہے۔ ساتھ چلنے کا وعدہ کریں۔ دس چکر لگا کر دکھا دوں۔“

”میں پاگل ہوئی ہوں کیا۔؟ اور ویسے بھی مجھے صرف انہیں ٹانگوں پر

پوری زندگی بسر کرنا ہے۔ ابھی توڑتاڑ کر بیٹھ گئی تو باقی عمر کیا کروں گی۔؟“

”میں جو آپ کا عدیل خدمت کو حاضر ہوں۔ نہ کندھوں پر ساری عمر

اٹھائے اٹھائے پھروں تو میرا نام بدل دیجیے گا۔“

”توبہ توبہ عدیل! کچھ تو خدا کا خوف کرو۔ یہ تم میرے ایسے ہی خیر خواہ ہو۔“

میرے لیے ایسی دعائیں کرتے ہو۔“

”وہ تو باجی! اپنے خلوص کا اظہار کر رہا تھا۔“

عدیل شوخی سے مسکرایا۔

”شکریہ۔!“

کوئل بڑبڑائی۔

”اور خدا حافظ۔!“

وہ کوٹھی کے صدر دروازے کے اندر داخل ہو گئے تھے۔ کوئل نے اسے

کندھوں سے پکڑ کر اس کا رخ واپس سڑک کی طرف پھیر دیا۔

”بے حد باتونی ہو۔ اور مجھ میں تمہاری مزید بک بک سننے کی اب ہمت

منہیں ہے۔ چلو بھاگ جاؤ۔
 ”گھر سے نکال رہی ہیں۔؟“
 ”ہاں۔ خدا حافظ۔!“

اسے باہر کی طرف دھکیل کر کوئل خود کو بھٹی کی طرف پلٹ گئی۔

عدیل مختلف پکیٹوں اور لفافوں سے لدا پھندا اس کے کمرے میں داخل
 ہوا۔

”لیجیے۔ یہ رہیں آپ کی چیزیں۔“
 اس نے کوئل کے پاس مسہری پر ہی سب کچھ بٹخ دیا اور خود نیچے قالین
 پر بیٹھتے ہوئے بولا۔
 ”بجدا تین گھنٹے تک اس دھوپ میں مارا مارا پھرا ہوں۔ تب کہیں جا کر
 پوری چیزیں ملی ہیں۔“
 پھر ہاتھ بڑھا کر ایک ایک پکیٹ اٹھانے لگا۔
 ”یہ رہیں آپ کی کتابیں۔ دیکھ لیجیے تمینوں ہی ہیں نا۔؟ یہ رہا آپ کا کپڑا۔
 اور یہ ہے۔۔۔“

جب سے آیا تھا کوئل خاموش تھی۔ اس نے بات ادھوری چھوڑتے ہوئے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
کوئل کے خوبصورت چہرے پر سدا کھیلنے والی مسکراہٹوں کے بجائے گھمبیر سی خاموشی مسلط تھی۔

”باہی! باہی کیا بات ہے۔؟ آپ تو بالکل گم سم بیٹھی ہیں۔“

وہ تب بھی خاموش رہی تو عدیل شرارت سے بولا۔

”یہ میری بلبل ہزار داستان آج خاموش کیوں ہے۔ ارے ارے۔“
اس نے اسے ہنسانے کی کوشش کی۔

”آمد تو نہیں ہو رہی۔؟ آپ تو واقعی بڑے سنجیدہ موڈ میں ہیں۔“

اور اب۔ اس کی بے قراری، اس کا خلوص دیکھ کر کوئل کو مسکرانا ہی پڑا۔

”نہیں۔ بات تو کچھ نہیں۔ لاؤ میری ساری چیزیں کھول کھول کر دکھاؤ۔“

وہ مسکراہٹ جو کوئل کے چہرے پر بکھری تھی۔ بالکل مصنوعی اور اوپری

سی تھی۔ اتنی۔ کہ عدیل کو بخوبی اندازہ ہو گیا۔

وہ جو پچھلے کئی مہینوں سے روز ہی اس کے پاس کئی کئی گھنٹے گزار رہا تھا۔

اسے کیا اب تک اس کے مزاج اور انداز کا بھی علم نہ ہو سکا تھا۔؟

”اجی میں کہتا ہوں آگ لگائیے ان چیزوں کو۔“

وہ یکدم جھنجھلا گیا۔

”مجھے یہ بتائیے کیا بات ہوئی ہے؟“

پھر اس کی طرف جھک کر ہوئے سے بولا۔

”کہیں فری سے کوئی جھگڑا دوگڑا تو نہیں ہو گیا۔“

”لو۔ میں کوئی جھگڑا لو ہوں جو جھگڑے کرتی پھروں گی۔“

”تو پھر ہوا کیا ہے۔؟“

وہ تیزی سے اور انتہائی بے قراری سے بولا۔

”کچھ کھو گیا ہے۔ کوئی نقصان ہو گیا ہے۔؟ ارے کچھ بولیے تو سہی۔ کیوں

میرے صبر کا امتحان لے رہی ہیں۔؟“

”اچھا اچھا بھئی بتاتی ہوں۔ تم تو مجھ سے لڑنے ہی لگے۔“

”تو پھر بولیے نا۔ میری پریشانی کا آپ کو احساس ہی نہیں کچھ۔ جیسے میں

انسان نہیں ہوں۔“

بڑبڑاتے ہوئے اس نے جیب سے سگریٹ نکالا اور بڑے مزے سے سلگا

کر کش پر کش لگانے لگا۔

کوئل متعجب ہوا کھٹی۔

”عدیل! یہ تم نے سگریٹ پینا کب سے شروع کیے ہیں۔ پہلے تو میں نے تمہیں

”اوہ باہی! معاف کرنا۔“

عدیل گھبرا کر جلدی سے بول پڑا۔

”میں پیتا تو کافی عرصہ سے ہوں۔ بس ذرا آپ کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے

آپ کے سامنے کبھی یہ جرات نہ کر سکا۔ اور اس وقت گھبراہٹ اور پریشانی

میں خیال ہی نہ رہا۔“

پھر ذرا دلیری سے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

”اچھا یہ بتائیے کہ یہ مبارک دن آئے گا کب۔؟ کوئی تیاری کروں۔؟ سوٹ بوٹ بنواؤں۔؟ ہاں آئے! کیا کیا کروں۔ مجھے تو جلدی میں کچھ سوچ جانی نہیں دے رہا۔“

”دیکھو بھئی عدیل! مجھے ایسے مذاق بالکل پسند نہیں۔“

وہ اسی طرح چھپے چھپے چہرے سے بولی۔

”تو پھر آپ کو کیسے مذاق پسند ہیں۔؟“

عدیل نے بڑھ کر اس کے ہاتھ چہرے سے ہٹانے کی کوشش کی۔

اتنی اچھی، اتنی پیاری لگ رہی تھی۔ وہ اسے مزید ستانے سے باز نہ

رہ سکا۔

”یہ تو بتائیے کہ وہ ظالم ہے کون جو میری پیاری باجی کو دلہن بنا کر

مجھ سے دُور لے جائے گا۔ یعنی وہ خوش قسمت کون ہے جسے آپ جیسا ہم سفر

ملے گا۔“

کول پھر اُداس سی اور چُپ سی ہو گئی۔ چہرے پر سے حیا کے رنگ سمٹ

کران کی جگہ افسردگی کی لہریں پھیل گئیں۔

”باجی! مجھ سے بھی چھپائیے گا۔ میں۔ جو آپ کا عدیل ہوں۔ آپ کا دوست!

اس کے انداز میں بھرپور خلوص کے ساتھ ہلکا سا شکوہ بھی تھا۔!

کول چونک اُٹھی۔ عدیل تو واقعی اس کا دوست تھا۔ پھر وہ ایک نامحرم

مرد کی طرح شادی کے موضوع پر اس سے شرما کیوں رہی تھی۔؟

آنکھوں میں بے پناہ اپنائیت اور ہونٹوں پر خلوص لیے وہ اس سے

”لیکن خدارا مجھے کبھی یہ نہ کہیے گا کہ عدیل اتنے سگریٹ نہ پیا کرو۔ کہ میں ایک معمولی سا حقیر سا انسان ہوں اور ایسا نہ ہو آپ کی عظمت کے سامنے سرکشی کرنے پر مجبور ہو جاؤں۔ پھر مجھے بھی دکھ ہوگا۔ خیر چھوڑیے اس ذکر کو اور مجھے بتائیے کہ آج آپ پریشان کیوں ہیں۔؟“

”بات یوں ہے کہ۔ ہاں اللہ! میں تمہیں کیسے بتاؤں۔ تم فری سے پوچھ

لینا۔“

”ارے ارے! آپ تو آج ماشاء اللہ باقاعدہ اور بے حد پیارے انداز

میں شرما رہی ہیں۔ ایمان سے آپ کو اس انداز میں شرما تا دیکھنے کی دل میں

بڑی حسرت تھی۔ اپنی تعریف سن کر تو آپ اکثر شرمایا ہی کرتی تھیں مگر یہ۔

یہ انداز۔ یہ تو کچھ اور ہی بتا رہے ہیں۔“

کول شرمانی جا رہی تھی اور عدیل جھک جھک کر اور گھور گھور کر اسے

دیکھے جا رہا تھا۔

”بالکل دلہنوں کی طرح شرما رہی ہیں۔ یہ جھکی جھکی نگاہیں۔ یہ لرزتی ہوئی

لمبی لمبی پلکیں کشمیر کے سیبوں کی طرح سُرخ چہرہ۔! کہیں خدا نخواستہ آپ کی

شادی کی بات چیت تو نہیں ہو رہی۔؟“

کول نے شرما کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔

”تو میرا اندازہ ٹھیک ہی نکلا نا۔ یعنی کہ میں خاصا عقل مند ہوں۔ آپ نے

تو نجانے کیوں ہمیشہ مجھے بے وقوف ہی سمجھا۔“

وہ اسی طرح چہرہ چھپائے بیٹھی رہی اور عدیل معمول کی طرح زبان چلاتا گیا۔

مخاطب تھا اور اس کے لیے پریشان ہو رہا تھا۔ بڑی غراب تھی وہ جسے اس کے جذبات و احساسات کا اندازہ نہ تھا۔

”ابا کے ایک دوست کے بیٹے ہیں۔ ڈاکٹر ہیں۔“

اور اب اس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بلا جھجک بتا دیا۔

”آپ ان سے مل چکی ہیں۔؟“

عدیل بھی اب سنجیدہ ہو گیا تھا۔

”ہاں۔ ایک دوبار سرسری سی ملاقات ہو چکی ہے۔“

”کیسے ہیں۔؟“

وہ اتنی اداس اتنی خاموش سی تھی۔ عدیل نے اس کی وجہ یہی سمجھی کہ وہ

کوئی اچھا انسان نہ ہو گا۔!

”کیا مطلب۔“

”میرا مطلب ہے کہ کیسے انسان ہیں۔؟“

اس نے جھجکتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کر دیا۔

”آپ پریشان جو ہیں۔!“

”پتہ نہیں کیوں پریشان ہوں۔ وہ کسی لحاظ سے بھی بڑے نہیں۔“

اب وہ عدیل سے اسی طرح کھل کر بات کر رہی تھی جیسے اپنی کسی سہیلی

کے ساتھ۔

”اچھا خاصا قبول صورت انسان ہے وہ۔ ڈیڑھ دو ہزار کی ماہانہ پینشن

ہے۔ زمینیں جائداد بھی ہے۔ طبیعت اور مزاج بھی شگفتہ ہے۔ گویا بظاہر ہر

لحاظ سے ناقابل انکار ہے۔“

”مگر آپ کو پسند نہیں۔ ٹھیک ہے نا۔؟“

اس نے گویا گول کے دل کی بات بوجھ لی۔ وہ خاموشی سے اسے تکیے لگی۔

خالی خالی نگاہوں سے۔

”اچھا یہ بتائیے پھر آپ نے فیصلہ کیا کیا ہے۔؟“

”ابھی تو میں نے کچھ بھی جواب نہیں دیا۔ فقط یہ کہا ہے کہ دو چار روز گھر

جائیے۔ سوچ لوں۔“

”کس سے کہا ہے۔؟ کس نے آپ سے جواب مانگا ہے۔؟ کس طرح یہ

رشتہ آیا ہے۔؟ مجھے ذرا تفصیل سے سب کچھ بتائیے نا۔ آپ تو مجھے شاید

اپنا سمجھتی ہی نہیں۔ ورنہ میرے پوچھے بغیر ہی اپنے آپ سب کچھ بتا دیتیں۔“

وہ بچوں سی کے انداز میں شکوہ کرتے ہوئے منہ پھلا بیٹھا۔

”نہیں عدیل! ناراض مت ہو۔ آؤ تمہیں ساری بات تفصیل سے

سناؤں۔“

وہ مسہری سے اٹھ کر نیچے اس کے پاس ہی قالین پر ہو بیٹھی۔

”ہوایوں کہ آج صبح فری یونیورسٹی چلی گئی، آبا و فر تو اُمّی نے مجھے بلا

بھیجا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کیا بات ہو سکتی ہے۔ میں چلی گئی۔“

”ہاں ہاں کہتی جاتیے۔ مابدولت سن رہے ہیں۔“

یوں جیسے وہ کوئی بہت بڑا منصف تھا اور پوری بات سننے کے بعد

ابھی ابھی انصاف بھرا فیصلہ سنا دے گا۔

کومل کو سنسی آگئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے اندر کی سوچوں نے اس کی سنسی کو توڑ دیا۔

”اور جب مجھے پتہ چلا کہ اُمی نے اس لیے بلایا ہے تو۔ تو پہلے تو یکدم میں پریشان ہوئی۔“

”کیوں۔؟ پریشان کیوں۔؟“

”پتہ نہیں کیوں۔ بس شادی کرنے کو ابھی میرا دل نہیں چاہتا۔“

”آخر کیوں۔؟ کیا کبھی بھی۔۔۔“

”نہیں نہیں۔ یہ تو قدرت کا قانون ہے۔ خدا کا حکم ہے۔ اس کے بغیر تو انسانیت ہی مکمل نہیں ہوتی۔“

”پھر ہاں کر دیجیے۔“

”لیکن ہاں بھی نہیں۔ کہ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میری زندگی کی موت ہو جائے گی۔ میری آرزوؤں، میری حسرتوں کی موت ہو جائے گی۔ ابھی نہیں۔ ابھی نہیں۔ دو چار سال بعد شادی دیکھی جائے گی۔“

وہ اپنے خیالات میں گم ہوتے ہوئے بڑبڑانے کے انداز میں بولنے لگی۔
”اور اُمی کے جواب میں میں نے ٹال جانے کی کوشش کی تو اُمی مجھ سے ناراض ہونے لگیں۔ پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ جانتے ہوا انہوں نے کیا کیا کہا۔؟“

”کیا۔؟“ عدیل سیدھا اور ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھ گیا۔

”کب تک یوں ہی بیٹھی رہو گی۔؟ اسی طرح بوڑھی ہو جاؤ گی تو کوئی منہ نہ

لگائے گا۔ ہماری پیشانیوں پر کالک لگے گی۔“

اتنے عرصے میں پہلی بار اس نے کومل کی آنکھوں میں موتی چمکتے دیکھے۔
”پھر وہ مجھے سمجھانے لگیں کہ لوگ کیا کہیں گے۔ جوان بیٹی کو گھر میں بٹھا رکھا ہے۔ نجانے کیا بات ہے۔؟ اور عدیل! کہتی بھی تو وہ سچ ہیں کون کسی کی زبان کھڑکتا ہے۔ جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے۔“
اس نے ایک بھی موتی ٹپکنے نہیں دیا۔ جانے کیسے اندر ہی اندر ساری نمی جذب کر لی۔

”مجھے لوگوں کی باتوں کی رتی بھر پرواہ نہیں کیونکہ سکیڈل بنانا تو ہر کسی کا مشغلہ ہوتا ہے۔ مجھے تو صرف یہ احساس چین نہیں لینے دیتا کہ میرے والدین کو میری وجہ سے لوگوں کی باتیں سننا پڑتی ہیں۔“

کومل نے تھوڑا سا توقف کیا۔ پھر ایک گہرا سانس لے کر کہنے لگی۔
”اُمی مجھے بڑی دیر سمجھاتی رہیں کہ لڑکا بڑا اچھا ہے۔ اچھے خاندان سے ہے۔ دیکھا بھالا ہے۔ یہ موقع گنوا نا نہیں چاہیے۔ اور بات بھی ٹھیک ہے عدیل! اگر دنیا والوں کی نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ ہزاروں میں ایک ہے مگر۔ مگر۔ نجانے کیوں۔؟ میرا دل نہیں مانتا۔ یہ وہ نہیں۔ یہ وہ نہیں۔ لڑکے کی وجہ سے اچھا خاندان، دولت مندی وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب صفات بڑی عام سی ہیں۔ میں ذہنی بلندی۔۔۔ اوہ۔! کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔“

اس نے پریشان ہوتے ہوئے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا۔ عدیل حیران سا اور قدرے پریشان سا اسے تکے جا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کوئل خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

”فی الحال تو میں نے اتنی سے کہہ دیا ہے کہ تین دن کی مہلت دیں۔ میں سوچ لوں۔ مگر تین دن کے بعد۔ یہ طوفان پھر آئے گا۔ مجھے لگتا ہے میری بات کسی نے ماننا نہیں۔ اتنے! میں کیا کروں۔؟ مجھے کوئی راستہ دکھاؤ عدیل! مجھے کوئی مشورہ دو۔“

”باجی! میں اس معاملے میں بالکل نا تجربہ کار ہوں۔ میں کیا مشورہ دے سکتا ہوں۔ اور پھر۔ یہ آپ کی زندگی کا معاملہ ہے۔ دوسرا کوئی بھی اس طرح نہیں سوچ سکے گا۔ جیسے آپ سوچتی ہیں۔ اور میں۔ میں تو۔“

”تم کیا۔؟ کیا تم ایک دل اور ایک دماغ کے مالک نہیں۔؟ اور کیا میرے دوست کی حیثیت سے تمہارا فرض نہیں کہ تم مجھے کوئی مشورہ ضرور دو۔“

جب اور کچھ نہ سوچا تو کوئل عدیل پر ہی برس پڑی۔

”یوں تو ہر وقت کہتے رہتے ہو کہ مرد ہو۔ مرد عمر میں چھوٹا ہو کر بھی عورت کا محافظ ہوتا ہے۔ یہ ہوتا ہے۔ اور وہ ہوتا ہے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے۔“

عدیل کی مردانگی کو چیلنج ہوا تو وہ جھٹ سے بولا۔

”آپ پریشان کیوں ہوئی جاتی ہیں۔ ابھی ہمارے پاس تین دن ہیں۔ آئیے مل کر کوئی راہ ڈھونڈتے ہیں۔ تین دن بہت ہوتے ہیں۔“

”نہیں عدیل۔!“

کوئل کی آواز سے مایوسی ٹپک رہی تھی۔

”زندگیوں کے فیصلے کرنے کے لیے تین دن تو کیا تین سال بھی کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔“

”تو پھر آپ انکار کر دیجیے۔“

عدیل نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

کوئل جھٹلا اٹھی۔

”مگر انکار کروں بھی تو کس بنا پر۔ آخر مجھے کوئی نہ کوئی جواز تو پیش کرنا ہی ہوگا۔“

”بس! کہہ دیجیے ناکہ آپ کو یہ رشتہ پسند نہیں۔ چلو جی بات ختم۔!“

اب عدیل بھی قدرے جھنجھلا کر بولا۔

”آپ کے ساتھ زبردستی تو یقیناً کوئی نہیں کرے گا۔“

”ہاں۔“ وہ مسکرائی۔ بڑے عجیب سے انداز میں۔!

”ہمارے سینوں میں ایک ماں کا دل نہیں۔ اور شاید ہم ایک ماں کے

جذبات سمجھنے کے بھی اہل نہیں۔ اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میرے اس

انکار سے میری ماں کو بہت دکھ پہنچے گا۔“

پھر وہ خیالوں میں کھو گئی۔ دُور خلاؤں میں تکتے تکتے بڑبڑائی۔

”شاید اپنے والدین کی خواہش پر مجھے اپنی زندگی بھینٹ چڑھانا ہی پڑے

یہ میرا اندر اتنا بے کل کیوں ہے۔؟ یہ میں کبھری کبھری سی کیوں ہوں۔؟ مجھے

کسی کی تلاش ہے۔؟ کس کی تلاش۔؟ نہیں۔ شاید اپنے والدین کا دل رکھنے

کے لیے مجھے اپنا دل توڑنا ہی ہوگا۔ انہیں دنیا کے سامنے سرخرو کرنے کے لیے

شاید مجھے اپنی آرزوؤں کا خون دینا ہی پڑے۔ ہاں۔ یونہی ان کی پیشانیوں کی
کالک مٹ سکے گی۔ شاید مجھے ہاں کرنا ہی پڑے۔ شاید۔ شاید۔!!
وہ اتنا دکھی ہو رہی تھی۔ اتنا پریشان تھی۔ اس کا دکھ۔ اس کی پریشانیاں
عدیل کے من میں اتری جا رہی تھیں۔

اس کے پاس الفاظ نہیں تھے جن سے وہ اسے تسلی دے۔ وہ اس کا دکھ
بانٹ سکے۔ پھر۔؟ پھر۔؟

اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اس کے لیے کیا کرے۔؟ کیا کہے۔؟
تب۔ اس نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ تسلی دینے کے انداز میں
انہیں پھتکتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

”فکر نہ کیجیے اللہ بہتری کرے گا۔“

جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ مسکرایا۔

”آپ کا یہ انداز۔! گو آپ کی سرشت کے خلاف ہے۔ مگر بہت خوبصورت
ہے۔ اور میں آپ کے لیے ضرور کچھ سوچوں گا۔ کہ آپ کی آنکھوں کی نئی مجھے حد
بے چین کیے دے رہی ہے۔!“

جانے کیا ہو گیا تھا۔؟ غینہ آہی نہیں رہی تھی۔ ہر طرح کوشش کی۔ ہر
ممکن طریقے سے غینہ کو پاس بلایا۔

مگر جب ذہن میں اور ہی سوچیں سمائی ہوں اور آنکھوں میں کسی کی نیر بہاتی
شبیبہ سی ہو تو پھر غینہ کا گزرواں کیسے ہو سکتا ہے۔

وہ کتنا پریشان تھی۔ کتنا دکھی تھی۔ رہ رہ کر اسی کا خیال آئے جا رہا تھا۔
اس نے اس کی بھگی بھگی آنکھیں پہلی بار دیکھی تھیں۔ اگر اس کی مسکراہٹوں
میں بجلیاں کوئی تھیں تو اس کے آنسوؤں میں ایسے طوفان تھے کہ جن میں عدیل
کو اپنا وجود اپنا آپ تنکے کی طرح بہتا محسوس ہوا تھا۔

کاش! وہ کسی طرح کوئل کی مدد کر سکتا۔ خواہ اسے کوئی بھی قربانی دینا پڑتی۔
بڑی سے بڑی۔ اپنی جان کی ہی سہی۔!

لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ خود بھی مجبور تھا۔ کومل بھی مجبور تھی اور اس کے والدین بھی مجبور تھے۔!

معاملہ کومل کا تھا مگر اپنی نیندیں اڑائے سوچوں میں وہ کھویا تھا۔ جانے کیوں اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ خود اس کا اپنا ہی معاملہ تھا۔ اپنا ہی مسئلہ تھا۔

کچھ ایسا تعلق۔ کچھ ایسا واسطہ۔ کچھ ایسا بندھن۔ ذہنی طور پر کومل کے ساتھ محسوس ہو رہا تھا کہ الگ بھی نہیں رہا جاسکتا تھا۔

تب اس کی سوچیں اسی کے لیے وقف ہو گئیں۔ اس کی نیند پر اسی کی حکومت ہو گئی۔!

اس کے والدین مجبور تھے۔ کہ آخروہ ان کی ذمہ داری تھی۔ اور دستور کے مطابق جوان بیٹی کو کوئی کب تک گھر بٹھا سکتا تھا۔ آج یا کل۔ آخر اسے دوسرے گھر جانا ہی تھا۔

”تو پھر۔ یہ دیر کیوں۔؟“ دنیا والوں کے اس سوال کا جواب کوئی بھی نہیں دے سکتا تھا۔ کہ یہ دیر کیوں۔؟؟

کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی عمر زیادہ ہو جائے اور وہ اپنے من کی سیج سجائے۔ ہاتھوں میں مہندی رچائے۔ سہرا باندھے۔ سرخ جوڑا پہنے بیٹھی رہے اور کوئی بھی نہ آئے۔ دل کے دروازے پر کوئی دستک نہ دے۔

پھر۔؟ پھر کیا ہوگا۔؟؟

وہ سوچ رہا تھا۔ صرف اس کے لیے۔ پورے خلوص اور ایمان داری کیساتھ

پھر۔؟ عمر بھر کا کنوار پن۔! تاریکی۔!! بھیا تک اور اتھاہ اندھیرا۔!! اور۔ اور وہ ابھی تک نہیں آیا۔ وہ جسے کومل کے ذہن نے اپنی حسین ترین خواہشوں کا پتے ہوئے جذبات اور تھر تھرائی ہوئی امنگوں کے ساتھ جنم دیا ہے۔

وہ۔ جس کی آنکھوں کی چمک کی تلاش میں اس نے آسمان کے سب ستارے چھان ڈالے ہوں گے۔

وہ۔ جس کا چہرہ تخلیق کرنے کے لیے اُس نے چاند کو بھی ٹھکرا دیا ہوگا۔

وہ۔ جس کی ایک مسکراہٹ بہار کے نام سے موسوم ہوگی۔

وہ۔ جس کا ذہن آکاش کی وسعتوں اور زمین کی گہرائیوں سے بھی زیادہ وسیع اور گہرا ہوگا۔

وہ۔ جو کومل کا آئیڈیل ہوگا۔!

دنیا کا حسین ترین آئیڈیل۔!

شاید وہ کبھی آہی جائے۔!

شاید۔!

مگر کب۔؟

کب۔؟؟

”اب تو وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ کومل کسی اور کی ہونے والی ہے۔

اور وہ۔ وہ نجانے کہاں ہے۔؟ آخروہ آتا کیوں نہیں۔؟ اس کی کومل، اس

کی دوست اس کے لیے اتنا پریشان ہے۔؟ وہ کہاں رہ گیا۔؟ کہاں کھو گیا۔؟“

اس کا ذہن جھنجھلا گیا۔
 یا شاید اس کا وجود ہی کوئی نہیں۔ کہیں بھی نہیں۔ سوائے کوئل کے ذہن کے۔!!
 اور جھلا خیالی تصویروں کا کون انتظار کرتا ہے۔؟ بگولوں کو کون اپنا سکتا ہے۔؟؟
 کبھی اسٹیل بھی گوشت پوست کے قالب میں ڈھل کر سامنے آئے ہیں؟
 ایسا بھی کبھی ہوا ہے۔؟ ایسا بھی کبھی ہوا ہے۔؟؟
 اسٹیل تو صرف دل بہلانے کو بنائے جاتے ہیں۔ اپنی انا کی تسکین کیلئے۔
 ان کی تلاش میں تو کوئی نہیں نکل پڑتا۔
 کوئل کتنی نا سمجھ ہے۔!
 آج اس نے پہلی مرتبہ اس انداز میں اور ان الفاظ میں اس کے متعلق سوچا
 اور اپنی جرات پر خود ہی حیران ہو گیا۔
 آخر لڑکی ہے نا۔ اسٹیل کی پرستار۔ جذبات کی غلام۔!!
 دوسروں کی والدین کی اسے پرواہ ہی نہیں۔
 اسے یہ شادی کر ہی لینی چاہیے۔ اسے دنیا کی خاطر، ماں باپ کی خاطر ہاں
 کر ہی دینی چاہیے۔
 اس نے فیصلہ کن انداز میں سوچا۔
 ہاں۔ اسے اب شادی کرنا ہی پڑے گی۔ اسٹیل پرستی اسے چھوڑنا ہی
 ہوگی۔ کہ اسی میں سب کی بہتری ہے۔ اسی میں خود اس کی بھی فلاح ہے۔!

وہ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہے۔ دکھی ہو رہی ہے۔ میں اسے سمجھاؤنگا۔
 یہی راہ دکھاؤں گا۔
 کیا پتہ وہی انسان اس کے اسٹیل کا روپ دھارے۔ کہ اب کسی
 بھی انتظار کا، جستجو کا مزید وقت نہیں ہے۔
 آخر اس کی سوچ مکمل ہو گئی۔ مطمئن ہو کر وہ سونے ہی لگا تھا۔ کہ۔
 "لیکن۔ لیکن۔!"
 وہ بے قرار سا ہوتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی شادی ہو گئی تو وہ
 خود اس سے دور چلی جائے گی۔
 زہر میں بجھے اک تیر کی مانند یہ خیال اس کے ذہن میں آ کر پورست
 ہو گیا۔
 وہ کانپ اٹھا۔ وہ لرز اٹھا۔ اس کا سارا وجود ڈگمگا گیا۔ طوفانی لہروں
 میں گھری کشتی کی طرح!
 پھر شاید اس سے ملنا بھی مشکل ہو جائے۔ اور شاید وہ اپنے شوہر کو پا کر
 عدیل کو کبھی یاد بھی نہ کرے۔
 یا پھر شاید اس کے شوہر ہی کو ان کا میل جول پسند نہ آئے۔ اور۔ اور
 ایک دن وہ کوئل سے کہہ دے۔
 "مجھے عدیل سے تمہارا ملنا جلنا پسند نہیں۔ اسے کہہ دو یہاں نہ آیا کرے۔"
 یوں۔ یوں پھر وہ کوئل سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ جائے گا۔ اس سے
 کبھی بھی نہیں مل سکے گا۔؟ کبھی بھی نہیں۔!!

تو پھر۔ وہ زندہ کیسے رہے گا۔؟ کوئل اس کا سورج ہے وہ روشنی کہاں سے پاتے گا۔ اس کی راہیں تاریک ہو جائیں گی۔ اس کی حیات اندھیروں میں ڈوب جائے گی۔

وہ ختم ہو جائے گا۔ اس کی موت واقع ہو جائے گی۔ اور۔ کوئل کے بغیر وہ اپنی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ کوئل کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔

”کیوں۔ کیوں۔؟“

”کیونکہ۔ کیونکہ۔ مجھے کوئل سے محبت ہے شاید۔!“

وہ چونک پڑا۔ اپنے اندر سے ہی خائف ہوا اٹھا۔

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ اس کے دماغ نے اسے سیدھی راہ دکھانا چاہی۔“

”وہ صرف اپنے آئندیل سے محبت کرتی ہے۔ وہ اسی کی منتظر ہے۔“

”تھیں کیا سمجھے گی۔؟ تم اس کے ایک دوست ہو۔ محض ایک دوست۔!“

”مگر۔ مگر۔ اس کے دل نے سرگوشی کی۔“

”تمہارا تو وہ آئندیل ہے۔ تمہاری تو وہ روشنی ہے۔ تم تو اس سے محبت کرتے ہو۔ اس دن سے جب تم اس سے پہلی بار ملے تھے۔ یا شاید پچھلے جنم سے۔ ازل سے۔“

”تھیں کوئل سے محبت ہے۔!“

”تھیں کوئل سے محبت ہے۔!“

”وہ تمہارا آئندیل ہے۔!“

کائنات کا ہر ذرہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

”تمہیں کوئل سے محبت ہے۔!“

”وہ تمہارا آئندیل ہے۔!“

”ہاں۔ مجھے اس سے محبت ہے۔ وہ میرا آئندیل ہے۔“

وہ بلند آواز میں چلا پڑا۔ اور اسے یوں لگا گویا اس نے صدیوں سے

سر بستہ کوئی راز فاش کر دیا تھا۔

”ہاں۔ مجھے کوئل سے محبت ہے۔ وہ میرا آئندیل ہے۔“

”مگر مجھے پہلے اس کا احساس کیوں نہ ہوا۔؟“

اس نے اپنے دل سے سوال کیا۔

”تم اپنے آپ کو دھوکا دیتے رہے ہو۔ حالانکہ تم پہلے دن سے جانتے تھے

کہ تم اس سے پیار کرتے ہو۔“

”ہاں۔ تم سچ کہتے ہو۔ مجھے روزِ اول سے احساس تھا۔ لیکن میں اس سے

کم تر ہوں۔ بہت ہی حقیر۔ اگویا آفتاب کے مقابلے میں ذرہ۔!“

حقیر۔ بنا چیز۔!“

”اوہ خدایا۔! یہ کیسا انکشاف ہے۔؟ یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔؟ یہ

مجھے کیا ہو گیا ہے۔؟“

اس نے پریشان ہو کر ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

”اب۔ اب کیا ہو گا۔؟“

”ہونا کیا ہے۔؟“ دل نے گدگدی کی۔

”اپنی محبت کو اپنے آئندیل کو اپنالو۔“

دماغ نے پھر سمجھایا۔

”مگر اس کا اپنا آئندیل۔؟“

”میں بنوں گا۔ میں بنوں گا۔ اسے جس کا انتظار ہے اس کا روپ میں دھاروں گا۔ میں اسے زندگی کا ہر سکھ دوں گا۔ میں اسے حیات کی ہر خوشی دوں گا۔ میں اس کی تمناؤں، اس کی آرزوؤں کا مرکز بنوں گا۔ کہ میں اس کی عادات، اس کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اسے دولت کی، اسے دنیاوی کسی آسائش کی چاہت نہیں۔ وہ ہونے والے شوہر کا جس قسم کا دل اور دماغ چاہتی ہے۔ ان کا مجھے اچھی طرح علم ہے۔ میں خود جو اس وقت ہوں۔ مٹ جاؤں گا۔ اور پھر۔ ایک نیا انسان، نیا عدیل خلق ہو گا۔ جو کومل کا آئندیل ہو گا۔ اُس میں۔ کومل کا آئندیل۔ کومل کی محبت۔!! میں بنوں گا میں! کہ مجھے بھی اس سے محبت ہے۔ شدید محبت۔! میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔!!“

عدیل! بیٹے اٹھو نا۔ کیا کالج نہیں جانا۔؟“

امی اب قدرے جھنجھلا کر بولیں۔

صبح کی چوتھی بار اسے جگانے آپکی تھیں۔ مگر وہ بازوؤں میں سر گھسیڑے اونڈھا پڑا ایسی گہری نیند میں ڈوبا تھا کہ وہ جاگ ہی نہیں رہا تھا۔

امی کے زور زور سے جھنجھوڑنے اور ہلکی سی ڈانٹ پر اس نے اسی طرح پڑے پڑے جواب تو دے دیا مگر اٹھا نہیں۔

”آج مجھے یونیورسٹی نہیں جانا“

”نہیں جانا۔ کیوں۔؟“

وہ متحیر سی ہو گئیں۔ اس نے تو کبھی چھٹی نہیں کی تھی۔

”میرا پروفیسر آج چھٹی پر ہے۔“

وہ صاف جھوٹ بول گیا۔

”پھر اٹھو۔ ناشتہ تو کرو۔“

اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ اسی اعتبار کے سہارے اُچی نے جھٹ یقین کر لیا۔

”دل نہیں چاہ رہا۔“ چھپے چہرے سے مدھم سی آواز ابھری۔

”عجیب لڑکا ہے کبھی اتنی مدیر تک نہیں سویا۔ آج سنا جانے کہاں سے اتنی نیندیں اس پر ٹوٹ پڑی ہیں۔ اچھا بھلا کچھلے چند دنوں سے اتنی باقاعدگی سے نماز پڑھنے لگا تھا۔ آج وہ بھی چوپٹ۔ جانے کیا ہو گیا ہے۔؟“

امی بڑبڑاتے بڑبڑاتے باہر نکل گئیں۔

امی چلی گئیں۔ وہ پھر اسی طرح پڑا رہا۔ بڑی دیر۔ چپ چاپ۔ گم سم۔! پھر جانے یکایک کیا خیال آیا۔ اٹھ کر جلدی جلدی شبِ خرابی کا لباس تبدیل کیا۔ نہ منہ دھویا۔ نہ شیوکی۔ نہ بالوں کو سلجھایا۔

اس عجیب سے جلمے میں وہ گھر سے باہر جا رہا تھا۔ وہ جو ہمیشہ بڑی نفاست اور سلیقے سے لباس پہنے بنا گھر سے باہر قدم نہیں نکالا کرتا تھا۔ امی نے تعجب سے اسے دیکھا۔

”عدیل! کہاں جا رہے ہو۔؟“

وہ بیرونی دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ امی نے گھبرا کر پوچھا۔

”بس امی! ابھی آیا۔“

اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

”عجیب لڑکا ہے۔“

امی بڑبڑا کر اپنے کام میں لگ گئیں۔ سائیکل جسے وہ اپنا ساتھی کہا کرتا تھا۔ اس وقت اسے بھی ساتھ نہ لیا۔ پیدل ہی چلا جا رہا تھا۔ اپنے خیالوں میں مگن۔ اپنے من میں کھویا ہوا۔

پاس سے کئی رکشے انیسکیاں گزریں۔ مگر اسے تو جیسے سواری لینے کا بھی ہوش نہ تھا۔

اور اسے ہوش اس وقت آیا۔ جب وہ کوئل کے کمرے میں داخل ہوا۔ سامنے ہی وہ سفید کرتا اور شلوار پہنے بیٹھی تھی۔ شاید غسل کیا تھا۔ بڑی نکھری نکھری سی تھی۔ ہمیشہ سے بھی کچھ زیادہ ہی پاکیزہ سی لگ رہی تھی۔

لبے لبے بال شانوں پر کبھرے تھے۔ ہاتھ میں کنگھا ضرور تھا۔ گردہ چپ چاپ خیالات میں کھوئی بیٹھی تھی۔ کرکچھ نہیں رہی تھی۔

بے آواز چلتے ہوئے عدیل اس کے قریب جا بیٹھا۔ وہ اپنی محویت میں ابھی تک محو تھی۔ جھکی ہوئی نگاہیں قالین کے پھولوں میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ شاید خیالوں ہی خیالوں میں اپنے آئندہ کے نقش و نگار ان پھول پتیوں سے تراش، سنوار اور نکھار رہی تھی۔

مگر اس کا آئندہ تو وہ بننے والا تھا وہ خود۔ پھر وہ کہاں محو تھی۔ عجیب سا جذبہ سینے کے اندر ابھرا۔

وہ جلدی سے مگر ہولے سے کھنکھارا۔ کوئل نے چونک کر نگاہ اٹھائی۔

”ارے۔!“ وہ عدیل کو بیٹھا دیکھ کر حیران رہ گئی۔

”آج یونیورسٹی نہیں گئے۔؟“
 ”نہیں۔ طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔“
 ”اے۔ تمہارے حیلے سے لگتا تو ایسا ہی ہے۔ آنکھیں بھی سرخ ہو رہی ہیں۔
 کہیں بخار و خار تو نہیں۔؟“
 کوئل نے بڑی ہمدردی سے اسے دیکھتے ہوئے بڑی اپنائیت سے اس کی
 نبض تھام لی۔
 وہ جو اکثر ایک دوسرے کا ہاتھ باز و تھام لیا کرتے تھے۔ مگر اس وقت جانے
 کیا ہوا۔؟ عدیل کو یوں لگا جیسے اس کے سارے جسم میں بجلیاں سی دوڑا ہٹی تھیں۔
 ایک جھٹکے سے اس نے کوئل کے ہاتھ سے اپنا بازو چھڑا لیا۔
 ”نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ بس ذرا رات نیند نہیں آئی۔“
 ”کیا بات ہے۔؟“ کوئل گھبرا گئی۔
 ”پریشان سے لگ رہے ہو۔ خیریت تو ہے نا۔؟“
 ”اے۔ اے۔ اس نے مسکرا کر ڈالنے کی کوشش کی۔
 مگر اس کا یہ انداز۔! یہ اک جھٹکے سے بازو چھڑا لینا۔ اس کے ذہنی خلفشار
 کا غماز تھا۔ ضرور اسے کوئی پریشانی لاحق تھی۔ کوئی بہت بڑی۔!
 ”دیکھو۔ مجھ سے جھوٹ مت بولو۔ صاف صاف بتا دو بات کیا ہے۔؟“
 کوئل نے اب سختی سے پوچھا۔
 ”سنو کوئل۔! تم سے ایک۔۔۔“
 ”ہائیں۔ ہائیں۔؟ کوئل مارے تعجب کے چلا سی پڑی۔

عدیل نے کبھی اس کا نام اس قدر بے تکلفی سے نہیں لیا تھا۔ کبھی اسے تم
 کر کے مخاطب نہیں کیا تھا۔
 ”یہ تم مجھ سے کس طرح بات کر رہے ہو۔؟“
 ”اوہ۔! وہ گڑ بڑا گیا۔
 ”دراصل۔ دراصل۔“ اور وہ پریشان سا ہو کر سر کو کھجلا نے لگا۔
 وہ پچھلی ساری رات اسی انداز میں اس سے مخاطب ہوتا رہا تھا۔ اسی
 لب و لہجے میں اس سے بات کرتا رہا تھا کہ۔
 اس کا اس کے ساتھ رشتہ ہی اب ایسا تھا۔ تعلق ہی ایسا قائم ہو گیا تھا کہ
 ان میں کسی قسم کے تکلفات کی بالکل گنجائش نہ تھی۔
 اور۔ اس کے علاوہ۔ اس کا رشتہ بھی تو اب اس کے ساتھ بڑا تھا۔ گو کوئل
 ابھی کچھ نہیں جانتی تھی مگر ذہنی طور پر وہ تو اس کا جو کچھ بن چکا تھا۔ بس بن ہی چکا
 تھا۔ اور اسے جو کچھ اپنا بنا چکا تھا۔ وہ بھی بنا ہی چکا تھا۔
 اب تو اس کا واپس اس پہلے والے تعلق کی طرف لوٹ کر آنا ناممکن تھا۔
 ”تم خاموش کیوں ہو گئے۔؟ یہ آج تمہیں ہوا کیا ہے۔؟“
 ”بتانے تو لگا تھا۔ مگر تم نے بیچ میں ہی ٹوک دیا۔“
 ”یہ کیا آج تم، تم لگائے ہوئے ہو۔؟“
 کوئل نے اپنے بڑے پن کا اسے پھر احساس دلایا۔
 ”سُنیے۔“ وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔
 ”میں آپ کا دوست ہوں نا۔؟“

”ہاں۔ ہاں۔ بالکل۔“

”پھر دوستی میں چھوٹا بڑا کوئی نہیں ہوتا۔ آئندہ مجھ پر ایسی کوئی پابندی نہ لگائیے گا۔“

بڑے پیار سے اسے دیکھتے ہوئے کوئل مسکرا دی۔ عجیب سا لڑکا تھا۔ اور عجیب عجیب خدیں کیا کرتا تھا۔

”اچھا۔ اس موضوع پر بعد میں بات ہوگی۔ پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم نے آج اپنا حلیہ کیا بنا رکھا ہے۔؟“

وہ شرارت بھرے لہجے میں ہنسی۔

”کسی لڑکی لڑکی کا چکر تو نہیں۔ اس عمر میں تم ایسے لڑکوں کو اکثر ایسے دورے پڑتے دیکھے ہیں۔“

”اس وقت میں مذاق کے موڈ میں قطعی نہیں ہوں۔“

وہ خاصی بد مزاجی سے بولا۔ اور کوئل کو احساس ہو گیا کہ وہ واقعی سنجیدہ تھا۔ اور معاملہ بھی کوئی سنجیدہ ہی درپیش تھا۔

”اچھا پھر بتاؤ۔ وہ کون سی بات ہے جس نے تمہیں رات بھر جگائے رکھا۔“

اب وہ بھی بڑی سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

”بات یہ ہے۔“ وہ سوچ سوچ کر بولا۔

کوئل ہمہ تن گوش ہو گئی۔

”بات یہ ہے کہ۔ چلو چھوڑو۔“

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے دل کا حال کس طرح اس پر عیاں

کرنے۔ بے حد گھبراہٹ ہوا تھا۔ بے حد شیطانی ہوا تھا۔

اور۔ اس کے انداز دیکھ کر بڑھتے ہوئے تجسس نے کوئل کو پریشان سا کر دیا۔

”دیکھو بھئی۔ ایہ عادت مجھے سخت ناپسند ہے کہ ایک بات شروع کر کے

یوں ادھوری چھوڑ دی جائے کہ دوسرا پریشان ہوتا پھرے۔“

وہ قدرے ناراض ہو گئی۔

”اچھا اچھا۔ کوئی کاغذ اور قلم مل سکتا ہے۔؟“

کوئل کی یکدم ہنسی چھوٹ گئی۔

”اب تم میرے سامنے بیٹھ کر مجھ سے خط و کتابت کیا کرو گے۔؟“

وہ ہنستی ہی چلی گئی۔

”اچھا ایڈ ونچر ہے۔!“

”بتاؤ نا۔؟“

وہ کھردرے لہجے میں بولا۔

”وہ سامنے میز پر پڑا ہوا ہے۔ پیڈ بھی اور قلم بھی۔“

جواب تو اسے دے دیا مگر اس کی ہنسی نہیں تھمتی۔ عجیب ہی لڑکا تھا۔

عدیل نے اس کی ہنسی کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ اٹھ کر میز کے قریب چلا گیا۔

وہیں کھڑے کھڑے پیڈ پر کچھ لکھا۔ کاغذ علیحدہ کیا۔ پھر تہہ کر کے کوئل کے پاس آگیا۔

”جب میں یہاں سے چلا جاؤں تو پھر اسے کھول کر پڑھنا۔“

یکدم کوئل کی ہنسی تھم گئی۔ اس کی جگہ چہرے پر تعجب کی لہریں پھیلیں۔

”یہ آج تم کیا پہیلیاں سی بوجھوا رہے ہو۔؟“
 ”دیکھو۔ میں نے جو کچھ کہا ہے اس پر عمل کرنا۔“

اس کے بچے میں عجب سارے عجیب تھا۔ خاصی بڑی عمر کے سنجیدہ سے مرد والا۔
 یوں۔ جیسے وہ اس سے بہت بڑا تھا۔ اور وہ اس کے مقابلے میں بے حد مٹی سی
 تھی۔

کچھ اسی انداز میں اس نے کہا تھا۔
 وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ اور کچھ کہنے ہی والی تھی کہ عدیل۔ ”خدا حافظ“
 کہتے ہوئے مڑ گیا۔

”ارے عدیل! ٹھہر تو سہی۔“
 وہ جلدی سے اٹھی۔ اس کے پیچھے بھاگی۔
 مگر وہ تو جا چکا تھا۔ بھاگ کر بالکنی میں پہنچی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا صدر
 دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔

آواز دینے ہی لگی تھی کہ وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔
 کوئل پریشان سی ہو گئی۔ یہ سب کیا تھا۔؟
 وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتی واپس کمرے میں آئی۔ جانے کیوں دل دھک دھک
 کیے جا رہا تھا۔ طبیعت میں عجیب سی الجھن سی جا رہی تھی۔
 سوچوں میں کھوئے کھوئے لرزتے ہاتھوں سے آہستہ آہستہ اس نے کاغذ کی
 تہیں کھولیں۔

اندر سے دل بُری طرح سہا جا رہا تھا۔ جلنے اس میں کیا تھا۔؟

تب۔ ڈرتے ڈرتے لکھے ہوئے پر اس نے نظر دوڑائی۔ پہلے تو الفاظ پڑھے
 ہی نہ گئے۔

وہ ناچ رہے تھے۔ پھیل رہے تھے۔ بکھر رہے تھے۔!!
 پھر۔ سارے حواس مجتمع کر کے ذرا غور سے دیکھا۔ تو۔
 یکدم اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ ٹانگیں اتنی زور سے لڑکھڑائیں کہ اس کے
 قدم فرش پر جھے نہ رہ سکے۔ وہم کر کے مسہری پر گر پڑی۔
 اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اسی یقین بے یقینی کے عالم
 میں دوبارہ کاغذ پر نظریں جمادیں۔

کوئل۔!
 مجھے تم سے محبت ہے۔ شدید اور گہری محبت۔ اپنی ہر تمنا، ہر خواہش
 سے زیادہ، اپنے وجود سے زیادہ۔ آج سے نہیں۔ ازل سے شاید۔!!
 کیا تم مجھ سے شادی کرو گی۔؟

دوست اور جیون ساتھی :-
 دونوں کے لیے معیار بہت مختلف ہوتے ہیں :-
 مختلف نقطہ نظر :-
 اور پھر - عدیل کی ابھی عمر ہی کیا تھی - بیس اکیس سال :-
 ابھی اس نے اپنا مستقبل بنانا تھا -
 اپنی زندگی کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا کرنا تھا -
 اپنی راہیں متعین کرنا تھیں -
 ابھی تو اس کو شادی کا خیال بھی دل میں نہیں لانا چاہیے تھا - خواہ کسی
 بھی لڑکی کے ساتھ :-
 لیکن - لیکن - آخر یکایک اس کے ذہن میں یہ خیال کیوں پیدا ہوا - ؟
 کب پیدا ہوا - ؟؟
 وہ رہ رہ کر اپنے دل سے یہ سوال پوچھتی تھی -
 وہ اسے گزشتہ سات آٹھ ماہ سے مل رہا تھا - مگر آج تک اس نے کبھی
 الفاظ میں یا اشارے کئے سے بھی ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ کوئی ایسا خیال دل
 میں چھپائے ہوئے تھا -
 لیکن - ایسے جذبات اتنی مدت کے لیے کون چھپا سکتا ہے - محبت کی آگ
 کو تو ایک دن کے لیے بھی پوشیدہ رکھنا انتہائی کٹھن ہوتا ہے :-
 پھر - پھر - ؟؟ - پھر شاید یہ خیال اس وقت اس کے دل میں پیدا ہوا جب
 اس نے اس کی شادی کی بات چیت کے متعلق سنا -

سائے لمبے ہو چکے تھے - آسمان کا مغربی کونا سنہرا ہو رہا تھا -
 کول گہری سوچ میں ڈوبی خلاؤں کو گھور رہی تھی -
 عدیل اس سے محبت کرتا تھا :-
 عدیل اس سے شادی کرنا چاہتا تھا :- !! نہیں یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا ؟
 دوستی اور محبت دونہایت قریبی رشتے ہونے کے باوجود ایک دوسرے
 سے بہت مختلف ہیں -
 ایک صرف رُوح کا رشتہ ہے اور دوسرے میں جسم کو بھی دخل ہے -
 ایک صرف تعلقات پر مبنی ہے اور دوسرے میں ساری زندگی - زندگی
 کا ہر لمحہ - خوشگوار ہو یا غمزدہ - مسکراتا ہو یا آنسو بہاتا ہو - ساتھ گزارنا
 پڑتا ہے -

ہاں - ایسا ہی ہوا ہوگا - ایسا ہی ہوا ہوگا - !!
 ”پگلا کہیں کا - اپنی دانست میں وہ میرے لیے قربانی کر رہا ہے۔“
 خیالات کے ذریعے کسی نتیجے پر پہنچنے کے بعد اب وہ بڑے پیار سے
 اس کے متعلق سوچ رہی تھی۔
 ”سمجھتا ہوگا کہ شاید میں کسی اور کے ساتھ خوش نہ رہ سکوں - یا کوئی دوسرا
 مجھے خوش نہ رکھ سکے۔ کہ اسے میری عادات و اطوار میرے مزاج و خیالات کا
 اچھی طرح علم ہے۔“
 وہ اسے اتنا عزیز تھا کہ اس کے لیے کومل کی سوچیں بھی مثبت انداز
 میں ہی سمجھتی تھیں۔
 مگر - یہ دنیا - دنیا کے لوگ - رشتہ دار - ملنے جلنے والے - سب کیا کہیں
 گے - اپنے سے پانچ سال چھوٹے لڑکے کے ساتھ - !
 ”اوہ - ! میرے سامنے کوئی ایسی بات کہے تو سہی - میں اس کی زبان نہ
 کاٹ ڈالوں - آنکھیں نہ نوچ لوں۔“
 سوچ ہی سوچ میں اسے غصہ آگیا - کہ اتنی عمر ہونے کے باوجود ہمیشہ
 اس نے اپنا دل ، اپنا دماغ ، اپنا دامن بڑا پاکیزہ رکھا تھا - کبھی کسی کو کوئی بات
 بنانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا - اور اب -
 تب غصے میں آکر خیالوں ہی خیالوں میں گویا اس نے کئی زبانیں کاٹ
 ڈالیں اور سینکڑوں آنکھیں نوچ ڈالیں - اس کی انگلیاں لہو سے بھر گئیں -
 ”پھر کہو گے ایسی رکیب بات - ؟“

وہ ان لوگوں کو سزا دے رہی تھی جو عدیل کے اور اس کے میل ملاپ پر شک
 بھری نظریں ڈال رہے تھے - اسے قصور وار ٹھہرا رہے تھے۔
 عدیل تو اس کا صرف دوست تھا - اور وہ پاگل تھا - جس نے اس کی خیر خواہی
 میں اس قدر غلط قسم کا فیصلہ کر لیا تھا۔
 اسے اس کے خلوص کی قدر تھی - وہ اس کی احسان مند تھی - جس نے اس
 کی بھلائی کے لیے اتنی بڑی بات سوچ لی - دنیا زمانے کی نظروں اور زبانوں
 کی پرواہ کیے بغیر - !
 اچانک کھنکھارنے کی آواز پر اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا چونک
 کر اس نے نگاہیں اٹھائیں -
 سامنے ہی عدیل کرسی پر سر جھکائے نظریں زمین پر گاڑے بیٹھا تھا -
 چہرے سے گویا وحشت سی ٹپک رہی تھی -
 ”عدیل - ! لمحہ بھر کے لیے وہ سب کچھ بھول بھال گئی -
 ”ارے بھئی تم کب آئے - ؟“
 اس نے حیران ہو کر پوچھا -
 ”آج تو بڑی خاموشی سے داخل ہوئے ہو - بالکل چوروں کی طرح - !“
 ”جس طرح کسی کی زندگی میں داخل ہوتے ہیں - بغیر احساس دلائے -“
 اس کے دل نے چوٹ کی -
 ”اوں ہوں - دماغ نے ڈانٹ پلائی - ایسی بے ہودہ باتیں کب سے سوچنا
 شروع کر دیں تم نے -“

عدیل اسی طرح بہت بنا، چپ چاپ بیٹھا تھا۔

”عدیل! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“

معا سے خیال آیا کہ اس کی اس حرکت کا پھٹنا و اب اس پر شروع ہوا تھا۔ وہ اس کی نظر سے نظر نہیں ملتا تھا۔ وہ اس سے شرمندہ تھا شاید کہ اس نے ایسی بات کیوں سوچی تھی؟

”پھر کیا ہوا؟ کوئی بات نہیں۔ غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے۔“

وہ خود ہی اس کی شرمندگی دور کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

”چھوڑو اب اس قصے کو۔ بھول جاؤ کہ تم نے مجھ سے کوئی ایسی بات کی تھی۔ اور اگر تم معافی مانگنے پر اتنے ہی مصر ہو تو چلو میں معاف کر دیتی ہوں تمہیں۔ تم بھی کیا یاد کرو گے کسی رجم دل باجی سے پالا پڑا تھا۔ جانتے ہو اب تو میں چند ہفتوں کی مہمان ہوں یہاں۔!“

عدیل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ نگاہ سے نگاہ ملی تو کول نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں میں اک عجب سی التجا تھی۔ خاموش۔ سہمی ہوئی۔

”تو۔ تو تم نے ہاں کر دی؟“

وہ جنوبی انداز میں چیخ سا پڑا۔ کول گھبرا گئی۔ نازک عورت کا نازک دل دہل گیا۔

”ارے بھئی نہیں۔ میں تو یونہی مذاق کر رہی تھی۔“

اس نے ہنس کر بات کرنے کی کوشش کی۔ ناکام سی۔!

”لیکن فرض کرو اگر میں نے ہاں کر دی ہوتی۔ تو۔؟“

”ہاں۔ آپ سچ کہتی ہیں۔“

عدیل بھراتی ہوئی آواز میں بولا۔

”تو بھی میں کیا کر سکتا ہوں۔ آپ سچ کہا کرتی ہیں۔ میں بہت کم عقل ہوں۔ اس بچے کی مانند۔ جو ماں کی گود سے ہمک کر چاند کو پکڑ لینا چاہتا ہو۔ مگر پھر ناکام رہنے پر روتا بلکتا ہوا ضد کرنے لگے کہ اتنی میں چاند توں گا۔ میں بھی وہی بچہ ہوں کول! میں نے آپ کی ہشک کی ہے۔ اور مجھے اس کا صدمہ ہے۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو۔“

اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ کول جلدی سے اٹھ کر اس کے قریب آئی اور اپنے دوپٹے کے کونے سے اس کے آنسو پونچھنے لگی۔

”مرد ہو کر روتے ہو۔؟ پگلے! مرد تو بڑی ہمت والے ہوتے ہیں۔ یہ آنسو ہم کمزور دل عورتوں کی میراث ہیں۔ واہ واہ! تم بھی عجیب ہو۔ سچ! تم نے تو مجھے مایوس ہی کر دیا ہے۔“

وہ بالکل بچوں کی مانند اسے گویا بہلا رہی تھی۔

”میں تمہیں معاف تو کر چکی ہوں۔ اگرچہ میرے خیال میں دوستوں سے معافی مانگنا رسم دوستی کے خلاف ہے۔ وہ تو ایک دوسرے کی کسی بات کا بُرا مانایا ہی نہیں کرتے تو پھر معافی کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے؟“

اس نے عدیل کا بازو پکڑ کر اسے اٹھایا۔

”چلو اٹھو۔ منہ دھو و چل کر۔ کوئی تمہیں یوں دیکھ لے تو یہی سمجھے کہ آج مجھ سے تمہاری پٹائی ہو گئی۔“

اس کے حکم پر وہ اٹھا۔ اسی طرح بازو سے پکڑے پکڑے کول اسے لے جا کر غسل خانے میں پھوڑا آئی۔

وہ منہ دھو کر نکلا تو کول نے اپنے بکھرے بال سمیٹ لیے ہوئے تھے۔ پاؤں میں سینڈل پہن کر سر پر دوپٹہ اوڑھ کر اور بازو میں پرس دکھا کر یوں تیار کھڑی تھی جیسے کہیں جانے کا ارادہ تھا۔

عدیل کو دیکھتے ہی مسکرائی۔ بے حد دلفریب مسکراہٹ تھی۔ عدیل کھوسا گیا۔ ”چلو منے! تمہیں سیر کرا لاؤں“

وہ شوخی سے بولی۔

”آج میرے پاس بہت پیسے ہیں“

”نہیں مجھے۔۔۔“

عدیل ٹانے کی گوشمالی کرنے لگا تھا کہ کول اس کا ارادہ بھانپ گئی۔ اسے بات بھی پوری نہیں کرنے دی۔

”دیکھو انکار نہ کرنا۔ اچھے بچے بن کر چپ چاپ میرے ساتھ چل پڑو۔ ورنہ ایسا نہ ہو تمہاری سچ مچ کی پٹائی ہو جائے“

اس کی یہی باتیں، یہی گھاتیں، یہی بے تکلفی، یہی ادائیں تو اسے لے ڈوبی تھیں۔

اک شکوہ بھری نگاہ کول پر ڈالتے ہوئے وہ اس کے ساتھ چل پڑا۔

بہت خاموش تھا۔ اپنے آپ میں کھویا ہوا۔ اپنی سوچوں میں ڈوبا ہوا۔ راستہ بھر کول کی یہی گوشمالی رہی کہ وہ کچھ بولے چالے۔ بہت سارے

مذاق کیے۔ بہت ساری شرارتیں کیں۔ مگر۔ اس نے تو شاید مسکرانے کی بھی قسم کھائی ہوئی تھی۔

تنگ آکر کول بھی خاموش ہو گئی۔

”میں ایک سوال کرنے لگا ہوں مگر خدا را اس کا غلط مطلب نہ لیجیے گا۔“

کیفے میں چائے پیتے ہوئے آخر اس کی گھمبیر خاموشی کا حصار ٹوٹا۔

”آپ نے اپنی اُمی کو اس ڈاکٹر والے رشتے کی بات کا کیا جواب دیا ہے؟“

کول جھوٹ نہ بول سکی۔ کہ واقعی یہ رسم دوستی کے خلاف تھا۔ اور وہ عدیل

کو اپنا بڑا پیارا، بڑا گہرا دوست سمجھتی تھی۔

جو کچھ دل میں تھا زبان پر آ گیا۔

”وہ تو قسمت کی خوبی سمجھو کہ ڈاکٹر صاحب چھ ماہ کے لیے انگلستان چلے گئے۔“

اس لیے فی الحال تو معاملہ ٹھنڈا ہی پڑ گیا ہے۔ ویسے ان کے آنے پر پھر یہ طوفان

اٹھے گا۔ ضرور۔ مجھے ایسے لگتا ہے۔“

”تو خدا کرے وہ کبھی نہ آئے۔ وہ مرجائے۔ اس کا بھار ڈوب جائے۔ کار

اُلٹ جائے۔ کوئی ہوائی حادثہ پیش آجائے۔ کچھ ہو جائے۔ کچھ ہو جائے۔ مگر وہ

واپس نہ آئے۔“

”کیوں اس بیچارے کو بڑی بوڑھیوں کی طرح بدعائیں دے رہے ہو؟“

عدیل کی اس بے ساختہ معصومیت پر کول کی ہنسی چھوٹ پڑی۔

”تمہارا کیا بگاڑا ہے اس غریب نے؟“

جانے کیا ہو گیا تھا۔؟ وہ اتنا سنجیدہ تھا اور کول کی ہنسی تھی کہ ختم ہی

نہیں رہی تھی۔

اور عدیل اپنے جذبات و احساسات میں ڈوبا تھا۔ اپنی سوچوں میں لگن با یہ لڑکی۔ کچھ بھی ہو۔ اس کے بغیر اس کی زندگی نامکمل تھی۔ اس کے پاس صرف جسم ہی جسم تھا۔ اور یہ اس کی رُوح تھی۔ حرارت تھی۔ اور رُوح کے بغیر جسم بے کار ہوتا ہے۔ حرارت کے بغیر جسم زندہ نہیں مڑہ ہوتا ہے۔

یہ ایک میز پر دھرے کول کے ننھے سے سفید سے ہاتھ پر اس نے اپنا بھاری ہاتھ رکھ دیا۔

”کول سنو۔ کل میں نے تم سے جو کچھ کہا تھا وہ کسی وقتی جذبے کا نتیجہ نہیں تھا۔ بلکہ میں نے اس کل کی پوری رات غور کیا تھا۔ آج بھی دن بھر میں اسی مسئلے پر سوچتا رہا ہوں۔“

کول چپ چاپ بڑے غور سے اس کی بات سن رہی تھی۔

”منطق، جذبات، عقل، جس پہلو سے بھی سوچوں۔ ایک ہی جواب ملتا ہے۔ جو میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں۔ اب تمہارا کیا جواب ہے۔؟“

”تم عدیل! بڑے بھولے ہو۔“

کول نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کے نیچے سے نکال لینا چاہا۔ مگر اس کی گرفت واقعی مردانہ گرفت تھی۔!!

کسما کر جدوجہد ترک کر دی۔

”ایک رات سوچ کر تم سمجھتے ہو کہ تم نے اس مسئلے کے ہر پہلو کو جانچ لیا ہے

لیکن تم نے یہ بھی سوچا کہ ابھی تمہیں اپنا مستقبل سنوارنا ہے۔ اپنا کیریئر بنانا ہے۔ زندگی یوں صرف سوچوں اور جذبات کے ریلوں میں بہہ کر نہیں گزرا کرتی عدیل میاں! تمہیں ابھی سے شادی کی فکر کیوں پڑ گئی۔؟“

”اوہ۔! آپ میری بات تو سمجھیے۔ میں یہ کب کہتا ہوں کہ آج ہی شادی کرالوں گا۔ میں انتظار کر سکتا ہوں۔ پانچ سال۔ دس سال۔ پچاس سال۔ لیکن جب بھی شادی کروں گا۔ صرف ایک ہی لڑکی سے۔ اور وہ تم ہو کول۔! اس نے گویا فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”تمہاری باتوں سے جذبات پرستی ٹپک رہی ہے عدیل۔! اگر تم کہتے ہو کہ تم نے اس مسئلے پر رتی بھر بھی سوچا ہے تو میں کہوں گی۔ تم جھوٹ کہتے ہو۔ اور کول بڑی سنجیدگی سے بڑی سوچ سمجھ کے ساتھ عدیل کو سمجھانے لگی۔

”تم نے یہ فیصلہ سراسر جذبات کی رُو میں بہہ کر کیا ہے۔ اور جذبات تو سمند کی لہروں کی مانند ہوتے ہیں۔ جوار بھاٹے کی طرح ان میں اتار چڑھاؤ آتے ہی رہتے ہیں۔ اور عدیل! میرے عزیز! جب اس طوفان کے بعد تمہارے جذبات اصلی مقام پر آئیں گے تو تب تمہیں احساس ہوگا کہ یہ فیصلہ کرتے وقت تم نے اپنی عقل کو ایک نشہ پلا کر سن کر دیا تھا۔ ناقابل حصول کی خواہش کا نشہ۔؟“ وہ سانس لینے کو لمحہ بھر کے لیے رُکی۔ عدیل نے کچھ کہنا چاہا مگر ہاتھ کے اشارے سے اس نے اسے خاموش کر دیا۔

”میری بات کا غلط مطلب نہ لینا عدیل! میں تمہارے لیے صرف اس وجہ سے ناقابل حصول ہوں کہ از دو واجی نقطہ نظر سے ہمارا جوڑ نہیں ملتا۔ تم ابھی

کم عمر ہوا اور میں تم سے پانچ سال بڑی ہوں۔ یوں بھی عورت مرد کی نسبت چھوٹی عمر میں باشعور ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے تو میری تمہاری عمر کا بہت فاصلہ ہے۔ بہت فرق ہے۔

”ہمارے رسولؐ کی شادی۔۔۔“

”رسولؐ، پیغمبروں کی مثالیں نہ دو عدیل! کوئل نے اس کی بات قطع کر دی۔ ہم ان کے پاؤں کی خاک بھی نہیں۔ ہم وہ سب کچھ نہیں کر سکتے جو انہوں نے کیا۔“

”لیکن ان کی مثالیں بھی تو اسی لیے ہیں کہ ہماری راہوں کی مشعل بن سکیں۔“

”تو۔ تو پھر سچی بات کہوں۔؟“

کوئل عجب معنی خیز سے انداز میں مسکراتی۔

”ہمارے رسولؐ نے جہاں پندرہ سال بڑی عمر کی عورت سے شادی کی تھی وہیں انہوں نے اور بھی بہت سی شادیاں کیں۔ جن میں ہم عمر بھی تھیں اور حضرت عائشہ صدیقہ ان سے بہت چھوٹی بھی۔ کہ فطرت کے بھی کچھ قوانین ہیں۔ کچھ تقاضے ہیں۔ تو کیا۔ تم بھی وہ فطرتی قوانین اور تقاضے پورا کرنے کے لیے مزید شادیاں کرو گے۔؟“

”توبہ! توبہ! آپ کیسی باتیں کرنے لگیں۔“

کوئل کے ہاتھ پر عدیل کی گرفت کچھ اور مضبوط ہو گئی۔

”میرے لیے تو صرف آپ۔۔۔“

”اب کہہ رہے ہونا۔ صرف اب۔ جبکہ تمہارا ذہن ابھی ناچختہ ہے۔ تم ابھی

دوست اور بیوی میں تمیز کرنے کی صلاحیت کے مالک نہیں بنے۔ ایک چھوٹا سا بچہ ایک عمر رسیدہ بزرگ کا دوست ہو سکتا ہے۔ ایک جانور انسان کا دوست ہو سکتا ہے مگر رفیق حیات کے لیے چند ایسی شرائط مقرر کر دی گئی ہیں جن کو نباہنا ہی پڑتا ہے۔ کچھ فطرت کے اصولوں کی وجہ سے اور کچھ دنیا کے رسم و رواج کے تحت۔ اور کچھ لوگوں کی زبانوں سے بچنے کے لیے۔“

”یہ تم کہہ رہی ہو کوئل۔ تم۔ جو کہا کرتی تھیں کہ تمہیں لوگوں کی باتوں کی پڑاہ نہیں۔ ان کے بنائے ہوئے رسم و رواج کی پرواہ نہیں۔“

”عدیل! ہر باغی فتح یاب نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی شکست بھی ماننا ہی پڑتی

ہے۔ اور پھر میں تو ایک کمزور سی لڑکی ہوں۔“

کوئل نے پڑ مردہ سے ہلچے میں کہا۔

”میں پہلے ہی بغاوت کے جرم میں ملوث ہوں کہ اتنی ساری عمر ہو گئی اور شادی نہیں کی۔ اور اب۔ دوسرا جرم۔ اپنے سے بہت چھوٹی عمر کے۔ اوہ! یہ نہیں ہو سکتا۔“

”نہیں کوئل! تم میں اتنی ہمت ہے کہ تم چٹانوں کو بھی ہلا سکتی ہو۔ تم دنیا سے بہت مختلف ہو۔ تم جرات والی ہو۔“

عدیل گویا اپنی ضد پراٹھا ہوا تھا۔

”نہیں نہیں۔ میری مجبوریاں بہت زیادہ طاقتور ہیں۔ مجھ سے کہیں زیادہ۔“

کوئل بھراتی ہوئی آواز میں بولی۔ پھر انتہائی بے بسی سے اس نے ہاتھوں

میں سر تھام لیا۔

وہ اسے بے حد اچھا لگتا تھا۔ بہت عزیز تھا اسے۔ وہ اس کا دل بھی توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اسے دکھ بھی پہنچانا نہیں چاہتی تھی۔ اور یہ رشتہ۔ اس کے ساتھ بیوی والے تعلق کے متعلق وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ آخر وہ کس طرح اسے سمجھائے۔!

”کیا تم اس بات سے واقف نہیں کہ میں نے آج تک تمہیں ایک دوست کے علاوہ اور کسی نظر سے نہیں دیکھا۔ میں نے ہمیشہ تمہیں اپنا ایک مخلص ترین دوست سمجھا ہے۔ اب میں اپنے نظریات یکایک کیسے بدل لوں۔ یہ تو میرے لیے ایک عظیم ذہنی سانحہ ہو گا۔“

”مگر کومل! دوستی ایک سنگ میل اور شادی منزل بھی تو ہو سکتی ہے۔ آؤ ہم اپنی منزل کو پالیں۔“

”دوستی کو اتنا حقیر نہ گردانو عدیل! دوستی بجائے خود ایک منزل ہے۔ اور اس راہ کے ہم سفروں کی قدر کچھ اور ہی ہے۔ میں تم ایسے دوست کو کسی صورت بھی کھونا نہیں چاہتی۔ خواہ تمہارا نیا رپ بہت شاندار ہو بیٹھال ہو۔ بہت اعلیٰ ہو۔ مگر مجھے اس تعلق میں اس روپ میں تم بہت عزیز ہو۔ بے حد۔!!“

”تو گویا پھر آپ کو انکار ہے۔؟“

عدیل کے چہرے پر مایوسی کی پرچھائیاں اتنی گہری تھیں کہ کومل لرز اٹھی۔ زندگی کے چہرے پر موت کو قصاں اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ فوراً اپنا موڈ بدل لیا۔ چہرے کی سنجیدگی پر سکراہٹ کی ردا تانتے ہوئے

شوخی سے بولی۔

”ارے! تم تو انکار و اقرار کی باتیں یوں کر رہے ہو جیسے قاضی ساتھ لے کر آئے ہو۔ ابھی بہت وقت ہے۔ تم بھی سوچو۔ میں بھی سوچتی ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اور یہ یقین رکھو کہ میں اپنی خوشی پر تمہاری خوشی اور تمہارے فائدے کو ترجیح دوں گی۔ اچھا اٹھو اب چلیں۔“ کومل نے عدیل کا ہاتھ تھام لیا۔ اسی خلوص کے ساتھ۔ اسی پیار کے ساتھ!!

”تو پھر آپ اپنا فیصلہ کب کریں گی۔؟“

راستے میں عدیل نے پھر وہی ذکر چھیڑ دیا۔ اور اب کومل نے اسے مزید کوئی نصیحت کرنے یا سمجھانے کے بجائے دوستانہ انداز میں مشورہ دیا۔

”اچھا دیکھو۔ آج بدھ ہے۔ اگلے بدھ تک تم اس پر اچھی طرح غور کرو۔ ٹھنڈے دل سے۔ میرے لیے نہیں۔ اپنے لیے۔ پھر اس کے بعد ہم دوبارہ اسی موضوع پر گفتگو کریں گے۔ ٹھیک ہے نا۔؟“

عدیل فوراً مان گیا۔ بارے اس نے اس موضوع پر دوبارہ گفتگو کرنے کا وعدہ تو کیا تھا۔!

”چلیے ٹھیک ہے۔ لیکن میں اس شرط پر سوچوں گا کہ آپ بھی اس پر غور کریں۔ اپنے لیے نہ سہی۔ میرے ہی لیے سہی۔ شاید آپ کے دل کے کسی گوشے میں بال برابر جگہ میرے لیے بھی نکل آئے۔“ اس کا لہجہ بڑا یاس بھرا تھا۔

”بال برابر۔؟ ارے پگلے! سارا دل ہی تمہارا ہے۔ مگر بحیثیت دوست کے۔“

کومل نے عدیل کا ہاتھ دبایا۔
”تم مجھے بے حد عزیز ہو۔ بے حد۔۔!“

پچھلے سات دن وہ بہت خاموش رہی تھی۔ بالکل گم سم سی۔ کہیں آتی گئی نہیں۔ کوئی کام نہیں کیا۔ ٹوہنگ سے ایک دن بھی کھانا نہیں کھایا۔ نہ اپنے لباس کا ہوش تھا نہ اپنی ذات کی پرواہ۔
آتی، آبا، فریج، کینز۔ سب نے ہی فرداً فرداً اس کی وجہ پوچھی۔ مگر وہ کسی کو بھی تسلی بخش جواب نہ دے سکی۔
دیتی بھی کیا۔ ہر ایک کے خیال کی تان آخر یہیں آکر ٹوٹتی تھی۔ کہ کہیں اس کی طبیعت تو خراب نہ تھی۔
جھوٹ بھی نہ بول سکی۔ ورنہ کسی اور طرح ٹال مٹول کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ طبیعت کی خرابی کا سن کر کسی نے بھی کوئی دوسرا سوال نہیں کرنا تھا۔ مگر۔
طبیعت بھی خراب نہیں۔ بس پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔“

آئی آبانے تو کوئی معنی خیز نظر اس پر نہیں ڈالی کہ انہیں اپنی دانشمند
بیٹی پر مکمل عبور و سہ اور اعتماد تھا۔ مگر فریجہ عجیب انداز میں اسے دیکھتی رہی۔
کینز البتہ ہمیشہ سے زیادہ اس کا خیال رکھ رہی تھی۔ جانے اس کی کومل
بی بی کو اندر ہی اندر کیا پریشانی تھی۔ اس کا خلوص اس کی وفا اپنی کومل بی بی
کی سب فکریں سب پریشانیوں اپنے اندر سمیٹ لینا چاہتی تھی۔ مگر وہ بتا ہی کچھ
نہیں رہی تھیں۔

تب۔ بدھ کا دن آگیا۔ فریجہ یونیورسٹی چلی گئی۔ آباد فر اور امی کینز کو ساتھ
لیے کمروں کی صفائی اور باورچی خانے کے کاموں میں لگ گئی تھیں۔
کہ۔ عدیل آگیا۔ گو وہ وعدہ کے مطابق آیا تھا۔ مگر کومل کو اس کی آمد
کی اس وقت توقع نہ تھی۔ یونیورسٹی اسے بھی تو جانا تھا۔ مگر وہ تو چھٹی ہی کر
بیٹھا تھا۔

اسے دیکھ کر کومل کچھ پریشان سی ہو گئی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ بدھ کا
دن کبھی نہ آئے۔ مگر دن بھی آگیا تھا اور عدیل بھی۔
خلاف معمول آج اس کا لباس ملگجاسا ہو رہا تھا۔ لمبی چوٹی پیچھے لٹک تو رہی
تھی مگر الجھی الجھی سی۔ جیسے کچھلے دو دن سے اس نے بالوں کو سنوارا نہ تھا۔
سرخ و سپید چہرہ کچھلے دنوں کی نسبت پیلا سا پڑا ہوا تھا۔ اور آنکھوں میں
بے خوابی کے گلابی گلابی ڈورے۔

اس کے برعکس عدیل بڑے خوشگوار موڈ میں تھا۔ نکھر نکھر چہرہ صاف ستھرا
لباس۔ سلیقے سے بنے ہوئے بال۔ اور۔ آنکھوں میں چمکتے ستارے اور ہونٹوں

پر تبسم کی بجلیاں۔
"کومل! میں نے ایک ایسا پروگرام سوچا ہے کہ سنیں گی تو میری عقل کی داد
دیئے بنا نہ رہ سکیں گی۔"

وہ اپنے اندر کی خوشیوں میں ایسا مدہوش تھا کہ کومل کا یہ حلیہ بھی اسے چونکا
نہ سکا۔ کوئی جواب دینے کے بجائے کومل خاموشی سے اسے تنکے جا رہی تھی۔
"سنو۔ اگر میں اس سال ایم۔ اے کروں تو پھر میں اعلیٰ ملازمتوں کے
امتحان کی تیاری شروع کر دوں گا۔ میں خوب محنت کروں گا۔ خوب محنت کروں گا۔
اور تم میرے لیے دعا مانگنا۔ پھر یقیناً میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ میری محنت اور
تمہاری دعائیں۔ کامیابی یقینی۔!"

"ہاں ہاں پھر۔؟ کومل قدرے الجھی۔
"پھر۔؟ بس۔ کامیابی کے بعد ایک دو انٹرویو۔ پھر ٹریننگ۔ اور پھر
ملازمت۔ لوجی۔ ہم تو اپنے قدموں پر کھڑے ہو گئے۔"
بڑے سرور لہجے میں اس نے بتایا۔
"اور پہلے تمہارا کیا کرنے کا ارادہ تھا۔؟"
کومل جھنجھلا پڑی۔ کیسی بے تکی انہی رہا تھا۔
"پہلے کی نہ پوچھیں۔ مسکراتے ہوئے وہ ہولے سے بولا۔
"پہلے تو شاید ایم۔ اے میں ہی دو چار سال لگا لیتا کہ یہ طالب علمی کی فراغت
مبہری زندگی بہت اچھی لگتی تھی۔"

"تو پھر وہی پروگرام ٹھیک رہے گا۔"

اس کی بات سمجھ کر عدیل نے شکوہ بھری نگاہ سے اسے دیکھا۔

”آپ شاید مجھے پاگل سمجھتی ہیں؟“

اس کا لہجہ اس کا انداز یکدم بڑا افسردہ ہو گیا تھا۔ اور اس کی افسردگی کوئل کو قدرے بے چین سی کر گئی۔ اس کی خاطر جھٹ سے مسکراتے ہوئے بولی۔

”وہ تو میں مذاق کر رہی تھی۔“

پھر اس نے بڑی کوشش سے اپنے موڈ کو خوشگوار بنایا۔

”اں پھر۔ تم اپنا کوئی پروگرام مجھے بتا رہے تھے؟“

”اں؟ کوئل کو متوجہ پایا تو اس کی آنکھوں میں بے شمار ستارے جاگ پڑے۔“

اس کا ہاتھ تھام کر مسکراتے ہوئے بولا۔

”اب تو میری منزل میرے سامنے ہے نا۔ میری زندگی کے پروگرام ہی بدل گئے۔ پہلے سنجیدہ نہیں تھا۔ اب سنجیدگی اور ایمان داری سے سب کچھ کروں گا۔“

کوئل نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں سے نکالنے کی کوشش کی مگر اس کی

گرفت بہت مضبوط تھی اور خود وہ اپنے ہی من میں کھویا کہے جا رہا تھا۔

”یوں زیادہ سے زیادہ مجھے تین سال کی مدت درکار ہوگی۔ مجھے یقین ہے

ان تین سالوں میں میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاؤں گا۔ کہ میرا روشنی کا مینار

میرے سامنے ہے۔ میں بھٹکوں گا نہیں۔ پھر تین سال بعد۔ ہماری شادی ہوگی

تم اتنا عرصہ میرا انتظار کرو گی نا۔؟ صرف تین سال۔“

”تو گویا تمہارے سر سے ابھی وہ بھوت اُترا نہیں؟“

کوئل کی کمزوری آواز ابھری تو۔ عدیل نے اپنی گم شدگی میں سے خود کو پالیا۔

چونک کر اس نے کوئل کو دیکھا۔ اس کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ عدیل

نے اسے زور سے مل ڈالا۔

”میرے خیالات و جذبات کو آپ بھوت کہہ کر انہیں کی نہیں میری بھی

ہتک کر رہی ہیں؟“

پھر اس نے اس کا ہاتھ پرے پھینک دیا۔ اسی معصوم ادا کے ساتھ۔ اور

اسی ہمیشہ والے معصوم انداز میں روٹھ کر پرے ہٹ گیا۔

وہ مسکراتی۔ بڑی افسردہ سی مسکراہٹ تھی۔

”بڑی جلدی روٹھ جاتے ہو؟“

”آپ جو ایسی بات کرتی ہیں۔“

”تو۔ تو عدیل! تم کسی صورت بھی نہ مانو گے۔؟“

کوئل نے مایوس سے ہنسنے میں پوچھا۔

”اب تو چھٹکارا پانے کی ایک ہی صورت ہو سکتی ہے۔“

”وہ کیا۔؟“ کوئل نے جھٹ سے پوچھا۔

جیسے ڈوبتے ڈوبتے ہاتھ میں کوئی تنکا ہی آنے کی امید پیدا ہو جائے۔

”یہی کہ۔ آپ آج سے میرے ساتھ سارے تعلقات منقطع کر لیں۔ پھر جب

میں ملوں گا ہی نہیں تو یہ سارے جھگڑے خود بخود ختم ہو جائیں گے۔“

”خیر۔ یہ تو ناممکن ہے۔“

کوئل نے بلا سوچے سمجھے کہہ دیا۔ کہ عدیل اسے اتنا اچھا لگتا تھا۔ اتنا اپنا لگتا

تھا کہ اس سے تعلقات منقطع کر لینے کا وہ تصور ہی نہیں کر سکتی تھی۔

”یہ ناممکن ہے تو پھر میرا پروگرام، میرا ارادہ بالکل ممکن اور برحق!“
وہ بڑے خوشگوار لہجے میں بولا۔

وہ بڑی پُرمردہ اور اُنچھی اُنچھی سی تھی۔ جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

”میں تمہارے انکار کی وجہ بھی سمجھ گیا ہوں۔“
”کیا۔؟“ کوئل چونکی۔

”وہی۔ اسٹیل کی تلاش۔!“
”ارے گولی مارو اس اسٹیل واسٹیل کو۔“
کوئل جل کر بولی۔

”نہیں کوئل۔!“ وہ یکدم پھر سنجیدہ ہو گیا۔

”مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں آپ کے اسٹیل کی خاک پا کے بھی برابر نہیں۔ اور جس اسٹیل کے لیے آپ نے اتنے اچھے اچھے رشتے ٹھکرا دیئے ہیں کوئی وجہ نہیں کہ آپ مجھے انکار نہ کر دیں لیکن۔ مجھے میرا اسٹیل مل گیا ہے اور میں کوشش کروں گا کہ مجھ میں ہی آپ کو بھی اپنا اسٹیل مل جائے۔“

”عدیل۔!“ جس سنجیدگی سے اس نے کہا تھا اسی سنجیدگی سے کوئل بولی۔
”اسٹیل سوچنے کے لیے ہوتے ہیں حاصل کرنے کے لیے نہیں۔ اور جو حاصل ہو جائے وہ اسٹیل ہی نہیں۔“

”خیر چھوڑیئے اس بات کو۔ یہ بتائیے کہ گزشتہ آٹھ دن میں آپ نے کیا سوچا ہے۔؟“

”میں تو یہ سوچ کر ہی لرز جاتی ہوں کہ تمہاری زندگی کا سکون میری وجہ سے لٹ جائے گا۔ تمہاری بربادی کا اگر کوئی باعث ہوگا تو وہ میں ہوں گی۔ میں۔ عدیل میں۔! کوئل۔! جو خود کو تمہارا مخلص ترین دوست کہتی ہے۔ جسے تم اتنے عزیز ہو کہ تمہاری معمولی سی خوشی کے لیے جان دے سکتی ہے۔ وہی کوئل تمہاری بربادی کا باعث بنے گی۔“

”بربادی۔؟“ یہ آپ کیا کہے جا رہی ہیں۔؟ کون سی بربادی، کس کی بربادی؟
”نفسیات میں میرا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ میرا تجربہ تم سے بہت زیادہ ہے عدیل۔! انہیں کی روشنی میں میں یہ سب کہہ رہی ہوں۔“
”کیا۔؟“

”کہ میرے ساتھ شادی کرنے والی تمہاری یہ ضد غلط ہے جتنا میں نے سوچا ہے اتنا ہی میرے دماغ نے میری عقل نے مجھے یہی سمجھایا ہے کہ آخر اس کا انجام پچھاوے اور محض پچھاوے ہی ہوگا۔“
”کیسے پچھاوے۔ کس پر پچھاؤں گا۔؟“

”اس وقت پر۔ اپنے اس قدم پر۔ جو تم اتنے اعتماد اور وثوق سے اٹھانے کو کہہ رہے ہو۔ لیکن اس وقت پانی سر سے گزر چکا ہوگا۔“
کوئل کی آواز بھرتی جا رہی تھی۔ خاموش ہو گئی۔
عدیل حیرت میں ڈوبا اسے تک رہا تھا۔

بھلا کوئل اتنی سنجیدہ کیوں ہوئی جا رہی تھی۔؟ اتنی پریشان کیوں ہوئی جا رہی تھی۔؟ اور اتنا سوچ کیوں رہی تھی۔؟ شادی ہی ہونا تھی نا۔ جو ہر لڑکی

کی ہوتی ہے۔

”ایک سوال پوچھوں عدیل۔؟“

چند لمحے خاموش رہ کر کچھ سوچنے کے بعد وہ بولی۔

”پوچھیے۔“

”فرض کرو میں تمہیں کہہ دوں کہ میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔ یہ میرا

اٹل فیصلہ ہے۔ تو۔؟ تم کیا کرو گے۔؟“

”میں۔ میں نہ ہر بچانک، ٹوں گا۔ دریا میں کود جاؤں گا۔ یا چلتی گاڑی کے نیچے سر دے دوں گا۔ جس زندگی میں آپ نہیں وہ زندگی مجھے قبول نہیں“

عدیل انتہائی جذباتی انداز میں کہے گیا۔

”مجھے علم نہ تھا کہ تم اس قدر جذباتی ہو عدیل! زندگی اس قدر حقیر شے

نہیں کہ اسے اپنے ساتھی کی تلاش میں کھو دیا جائے۔ خودکشی تو فرار کا

بھیانک ترین راستہ ہے۔ حقیقت اور سچائی سے فرار کا۔ یہ بزدلانہ حرکت

تم کرو گے۔؟ میں تمہیں آنا پست ہمت نہیں سمجھتی تھی۔“

عدیل چپ چاپ سر جھکائے اس کی سنٹارہ۔ جواب میں کچھ نہیں بولا۔

کول خوش ہوئی۔ اس پر اس کی نصیحتوں کا اثر ہو رہا تھا۔

”اچھا فرض کرو۔ تم ان میں سے کچھ بھی نہ کرو۔ تب۔؟ پھر تم کیا

کرو گے۔؟“

”تو میں کبھی شادی نہیں کروں گا۔“

اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”آپ کی جگہ اور کوئی لڑکی نہیں ملے سکتی۔ کوئی نہیں۔ کوئی بھی نہیں۔“

”پھر تم مجھے ملا کر دو گے۔؟“

”ملا کروں گا۔؟“

اس نے تعجب بھری نگاہ سے کول کو دیکھا۔

”میں یہ شہر، یہ ملک، اپنا گھر، والدین۔ سب کچھ ہی چھوڑ دوں گا تو پھر

آپ کو کیسے ملوں گا۔ آپ مصروف رہیے اپنے اسٹڈیل کی تلاش میں۔ آپ اپنے

لیے خوشیاں ڈھونڈیے۔ پائیے۔ اور خوش رہیے۔ پھر۔ پھر مجھ تباہ حال سے۔

آپ کو واسطہ بھی کیا۔“

”تم کس قدر بے رحم ہو۔ کتنے سنگدل ہو۔“

کول روسی پڑی۔

”جانے تم کچھ بھی کیوں نہیں سوچتے۔ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔“

”اچھا تو بتائیے آپ کا آخری فیصلہ کیا ہے۔؟“

عدیل نے بات ختم کرنے کے لہجے میں کہا۔ کول اس کے چہرے کی طرف

بغور دیکھ رہی تھی۔

اس کے انداز میں، اس کے لہجے میں ایسی سختی تھی، اس کے چہرے پر

ایسا غم تھا کہ راہ کی کوئی چٹان، دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا بند بھی اس طوفان

کو نہیں روک سکتا تھا جو اس وقت اس کے سر میں سما رہا تھا۔

اس میں ٹکرا جانے کی، سب کچھ ساتھ بہا لے جانے کی سی تندی تھی۔

اور وہ۔ وہ اس کی دوست تھی۔ اس کی بربادی اپنی آنکھوں سے نہیں

دیکھ سکتی تھی۔ خود برباد ہو سکتی تھی مگر اپنی وجہ سے کسی اپنے کو برباد ہوتا دیکھنے کی اس میں ہمت تھی نہ طاقت۔ !!

”خدا گواہ ہے کہ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ پوری طرح۔ میں نے ہر آنے والے خطرے سے تمہیں آگاہ کر دیا ہے۔ تم پھر بھی اپنی بات منوانے پر اڑے رہو تو۔ تو تمہاری مرضی۔ مجھے بہر حال تمہاری خوشی عزیز ہے۔ اپنی خوشیوں سے زیادہ تمہاری خوشی۔ !

”کوئل۔ ! وفور مسرت سے وہ چیخ سا پڑا۔

”تم کتنی اچھی ہو۔ تم کتنی عظیم ہو۔“

اس نے اسے بازوؤں میں بھر کر چکر دے ڈالا۔ وہ تو بالکل ہی دیوانہ ہو گیا تھا۔

”میں جانتا تھا کہ تم مجھے نہیں ٹھکراؤ گی۔ تمہارا یہ احسان میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ اس کے بدلے میں میں دنیا بھر کی خوشیاں تمہارے قدموں میں لا ڈھیر کروں گا۔ میں تم پر سے اپنی زندگی، اپنی محبت، اپنا تن من، سب کچھ قربان کر دوں گا۔ تمہاری اک اک مسکراہٹ کے لیے میں اپنی ہستی تک مٹانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑوں گا۔ تم دیکھنا تو سہی۔“

وہ جنونی انداز میں جانے کیا کیا کہے جا رہا تھا۔ اسے کچھ ہوش نہ تھا۔

”اب آج سے باجی واجی آپ واپ سب ختم۔ کوئی بڑاپن۔ کوئی چھوٹاپن نہیں۔ آج سے ہماری دوستی نے ایک نیا روپ دھار لیا ہے۔ آج سے تم میری صرف کوئل ہو۔ منی سی کوئل۔ ! عدیل کی کوئل۔ !!“

مگر کوئل ان سب باتوں سے بے نیاز کسی گہری سوچ میں غرق تھی۔ وہ اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں سے بھی بے نیاز تھی۔

اور۔ عدیل کہے جا رہا تھا۔

”کوئل! صرف تین سال کی بات ہے۔ اور یہ تین سال تو پلک جھپکتے میں گزر جائیں گے۔ پھر ہم ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔ صرف تین سال پھر تم۔ میں۔ کوئل۔ عدیل۔ دونوں کی ایک راہ۔ ایک منزل۔ ہم مل کر اک نیا جہاں آباد کریں گے۔ جہاں محبتیں ہوں گی۔ چاہتیں ہوں گی۔ پیار ہوگا۔ خلوص ہوگا۔ خوشیاں ہوں گی۔ اور۔ اور۔“

اور کوئل کی آنکھوں سے ٹوٹتے پکھرتے ہوئے ایک ایک موتی میں وہ اپنی ہی شبیہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے خیال میں یہ خوشی کے آنسو تھے۔

کوئل کی آنکھ سے گرنے والا ہر موتی مقدس تسبیح کا دانہ تھا۔ چونک کر اس نے اپنا رومال آگے کر دیا۔

عدیل کے ساتھ اس نے شادی کا وعدہ کر لیا تھا۔ اور گھر میں کسی کو اس بات کا علم ہی نہیں تھا۔ اس کے سینے پر اک بڑا بوجھ سا تھا۔ اور وہ امی کو جلد از جلد سب کچھ بتا کر یہ بوجھ ہٹانا چاہ رہی تھی۔

گو اس نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ ایک زندگی کو تباہی کے گڑھے میں گرنے سے بچا یا ہی تھا۔ کام اچھا تھا۔ نیکی کا تھا۔

پھر نجانے کیوں وہ امی کو بتانے میں ہچکچاہٹ سی محسوس کر رہی تھی۔ امی نے دوبارہ پوچھا تو اس نے ہمت کر کے ہوئے ہوئے انہیں وہ بات بتادی جو بڑی دیر سے اس کے اضطراب کا باعث بنی ہوئی تھی۔
”ہاں میں۔ اگلیاں غلاف چھوڑ چھاڑ، وہ سرکڑ کر بیٹھ گئیں۔

”بیٹی! تو نے ہاں کرتے وقت یہ نہ سوچا کہ تیرے آباکسی اور کوزبان دے چکے ہیں۔“

”مگر امی۔۔۔ وہ سٹپنا گئی۔ یہ تو اسے خیال ہی نہیں آیا تھا۔ لمحہ بھر کے لیے بھی اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔
”اب مگر وہ گریہ کرتی ہو۔“

اس کی توقع کے خلاف امی کو بے حد غصہ آ گیا تھا۔
”مجھے پہلے ہی شک تھا کہ روز روز کی ملاقاتیں، یہ اکٹھے آنا جانا، اور گھنٹوں بیٹھ کر کی جانے والی باتیں، ایک نہ ایک دن رنگ ضرور لائیں گی۔“

”امی۔ آپ مجھے شک کی نگاہ سے دیکھ رہی ہیں۔“
اس نے حیرت سے ماں کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس مشفق اور ممتا بھر

بہت دن ہوئے کوئل نے گدیوں کے لیے بڑے خوبصورت غلاف کاڑھے تھے۔ امی بیٹھیں انہیں ہی سی رہی تھیں۔ اور گدیوں پر چڑھا رہی تھیں۔
کوئل جب چپ چاپ آکر پاس بیٹھ گئی۔

امی اپنے کام میں لگی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد نگاہ اٹھا کر دیکھ لیتیں نہ وہ کوئی بات کر رہی تھی۔ نہ کوئی کام۔ بس خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی ناخنوں کو کریدے جا رہی تھی۔

اس کا یہ انداز۔ ہمیشہ سے بہت مختلف تھا۔ وہ تو یوں بے کار بیٹھنے والی نہ تھی۔ یوں وقت ضائع کرنے والی نہ تھی۔ ضرور کوئی بات تھی۔

تب امی نے پوچھ ہی لیا۔ اور وہ۔ جو اتنی دیر سے پریشان اور مضطرب سی بیٹھی تھی۔ چونک پڑی۔

چہرے کی طرف۔ جہاں آج ہمیشہ کی نسبت بہت مختلف عکس لہرا رہے تھے۔

غصہ۔ پریشانی اور بے اعتمادی۔ !!!

”میرے شک کی نگاہ سے دیکھنے یا نہ دیکھنے سے کیا فرق پڑتا ہے بیٹی! اتنا تو سوچا ہوتا کہ لوگ کیا کہیں گے۔ وہ تو پہلے ہی باتیں بناتے تھے۔ کہ جوان لڑکے کا گھر میں اس طرح کھلے بندوں آنا جانا اچھا نہیں۔ اور اب۔“

امی کی آنکھیں پر نم ہو گئیں۔

”جبکہ ان کے بدترین شبہات درست ثابت ہوں گے تو وہ کیا کیا کچھ نہ کہیں گے۔“

”مگر امی! لوگوں کے خوف سے کوئی زندہ رہنا تو نہیں چھوڑ سکتا۔“

اس کے اندر بغاوت کے جذبے نے کروٹ لی۔ اسے لوگوں کی باتیں بنانے والی ادا ہمیشہ سے ناپسند رہی تھی۔

”اگر ہم لوگوں کے معاملات میں دخل نہیں دیتے تو ان کو کیا حق۔۔۔“

”حق۔؟“ امی نے اس کی بات کاٹ دی۔

”لوگوں کو ہر حق پہنچتا ہے بیٹی۔! تم ابھی جوان ہو۔ تمہارے خون میں جوش ہے۔ گرمی ہے۔ جب میری عمر کو پہنچو گی تب تمہیں احساس ہو گا کہ لوگوں سے ڈرنا نہ سہی لیکن ان کے بالکل مخالف نہ چلنا ہی صحیح راستہ ہے۔“

امی کی بزرگی کا احترام کرتے ہوئے ان کی ہر بات کو وہ ہمیشہ جلد تسلیم کر لیا کرتی تھی۔ اپنی غلطی نہ بھی ہو تب بھی مان ہی جایا کرتی تھی۔

”اچھا پھر مجھے بتائیے میں اب کیا کروں۔؟“

”اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا بیٹی۔!“

اس نے ہتھیار ڈالے تو امی بھی نرم پڑ گئیں۔

”اب تم زبان دے چکی ہو۔ لیکن میرے خیال میں تمہیں ہاں کرنے سے

پہلے مجھ سے مشورہ کر لینا چاہیے تھا۔“

بے شک بعد از وقت تھا مگر امی نے پھر بھی اسے نصیحت کرنا ضروری سمجھا۔

”یہ بجا ہے کہ اب تم بالغ اور سمجھدار ہو لیکن بیٹی! عقل اور تجربہ دو مختلف

چیزیں ہیں۔“

کومل نے بڑی ایمانداری سے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔

”مجھے واقعی آپ سے اجازت لینا چاہیے تھی۔ مگر عدیل نے کچھ اس

انداز اور شدت سے تقاضا کیا کہ خود مجھے بھی سوچنے سمجھنے کا موقع نہ مل سکا۔

مشورہ یا اجازت تو بعد کی بات ہے۔“

”ہاں بیٹی! دل کے معاملے میں ہر شخص۔۔۔“

”امی۔!“ کومل کو جیسے انہوں نے گالی دے دی تھی۔ وہ یونہی تڑپ کر

بولی۔

”میں آپ کی ایک غلط فہمی دور کر دینا چاہتی ہوں۔ اگر آپ کا یہ خیال

ہے کہ مجھے عدیل سے کوئی عشق و شوق ہے۔ تو بخدا یہ غلط ہے۔ سراسر غلط۔

ہاں وہ مجھے اچھا لگتا ہے۔ مجھے بے حد عزیز ہے۔ مگر صرف بطور ایک

دوست کے۔“

”یہ لڑکے لڑکیوں کی آپس کی دوستی کا تک میری سمجھ میں نہیں آتا۔“

امی جل کر بولیں۔
 ”کیا اسے کوئی لڑکا اور تمہیں کوئی لڑکی دوست بنانے کو نہیں ملتی تھی؟“
 ”آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں امی۔؟ جب دوستی میں جنس کا عنصر ہی
 نہیں۔ اس کا عمل دخل ہی نہیں تو پھر جنس کے فرق کا احساس دوستی کے
 اصولوں کے خلاف ہے۔“

”مجھے تمہارا فلسفہ نہ آج تک سمجھ آیا ہے اور نہ ہی آئے گا۔ اب جو ہونا تھا
 سو ہو چکا۔ تم نے ہاں کہہ دی۔ اس نے یقیناً اپنے گھر میں بات کر دی ہوگی۔
 اب معاملہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ لہذا۔“

امی کچھ خاموش سی ہو گئیں۔ جانے ان کی چھٹی حس انہیں کیا سوچ رہی تھی
 ”اب تو میں تمہارے لیے دعائیں ہی مانگ سکتی ہوں۔“
 وہ ہولے ہولے بڑبڑانے لگیں۔

”آج تمہارے آبا سے بات کروں گی۔ لیکن انہوں نے بھی تو خود ہی نوں
 کو سر چڑھا رکھا ہے۔“

وہ زیر لب کچھ اور بھی کہے جا رہی تھیں مگر کوئل چپ چاپ وہاں سے
 اٹھ گئی۔

من کے اندر عجیب سی پریشانی اور بے کلی اتری جا رہی تھی۔!
 یہ دنیا کیسی تھی۔؟ وہ تو ایک زندگی کو تباہ ہونے سے بچا رہی تھی۔
 اور۔ اور۔ یہ سب کی سوچیں۔!

اوہ۔ یہ سب کیا تھا۔؟ یہ سب کیا تھا۔؟

انہیں سوچوں میں کھوئے کھوئے کئی گھنٹے گزر گئے۔ دوپہر کا کھانا بھی
 نہیں کھایا گیا۔ امی نے بھی زور نہیں دیا۔ شاید ابھی تک انہیں اس پر غصہ تھا۔
 چپ چاپ کمرے میں پڑی رہی۔ جانے کیا وقت تھا۔؟ ارد گرد کا کوئی
 ہوش ہی نہیں تھا۔

تب۔ آبا کے کھنکھارنے کی آواز پر ہی اسے اپنے پراگندہ خیالات سے
 جھٹکا ر ملا۔ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دوپٹہ ٹھیک طرح اوڑھا۔
 ”مجھ سے تمہاری امی نے بات کی ہے۔“

وہ کوئل کے پاس ہی آ بیٹھے۔ آبا نے ہمیشہ اس کے ساتھ اولاد کی بجائے
 دوستانہ قسم کے تعلقات رکھے تھے۔ تبھی تو وہ خود اس کے پاس آ گئے تھے۔
 ”مجھے تم پر بہت اعتماد ہے بیٹے۔! تمہاری پسند کبھی غلط نہیں ہو سکتی۔
 اور پھر تمہیں اپنا رفیق حیات چننے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔“

گو انہیں احساس تھا کہ انہیں اپنے دوست کے سامنے شرمندہ ہونا
 پڑے گا مگر پھر بھی انہوں نے بہت فراخ دلی کا ثبوت دیا۔

”آبا جی۔! کوئل نے باپ کے کندھے کے ساتھ اپنا سر رکھا دیا۔
 ”امی نے جو تھوڑی سی سرزنش کی تھی۔ جو تھوڑا سا غصے کا اظہار کیا تھا۔
 شاید اس سلوک کی تلافی باپ کی طرف سے تسلی و تسفی کر کے کرنا چاہتی تھی۔
 کوئی ہمدردی بھرے چند الفاظ سن کر دل کی بے کلی کو قرار بخشا جا رہی تھی۔
 آبا نے اس کے سر کو تھپتھپایا۔ اس کے اُلجھے اُلجھے بالوں کو ہاتھوں سے
 درست کرتے ہوئے بولے۔

”مگر بیٹے! تم نے اس بات پر غور کیا ہے کہ بڑا کام سے کئی سال چھوٹا ہے۔
اور عمروں کا اتنا فرق ذہنی پختگی کے فرق کا مظہر بھی ہو سکتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ
تم دونوں کا یہ فرق خدا نخواستہ تمہاری۔۔۔ لاجول ولاقوۃ۔ میں بھی کیسی باتیں سوچنے
لگ گیا ہوں۔“
وہ مسکرائے۔

”اچھا بیٹی! خدا تمہیں سدا خوش رکھے۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ کسی
قسم کا فکر نہ کرنا۔ تم نے جو فیصلہ کیا ہے۔ درست ہے۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض
نہیں۔“

اس کے فیصلے کو تسلیم کرنے کے بعد گواہانے عجیب ٹوٹے پھوٹے سے فقروں
اور الفاظ میں اپنا دوٹ اس کے حق میں دے دیا تھا مگر امی کو بتانے کے بعد
جو پریشانی لے کر وہ ان کے پاس سے اٹھی تھی۔

آبا کے انہیں بے ربط فقروں نے اس پر تسلی کا چھا ہار کھ دیا۔
جیسے آبانے اس کی پراہم سمجھ لی تھی۔ انہوں نے کوئی غلط معنی نہیں پہناتے
تھے۔ ان میں کوئی غلط تعلق قائم کر لیا تھا۔

عمر کے فرق کا انہوں نے اسے احساس دلانے کی یا سمجھانے کی جو کوشش
کی تھی۔ وہ تو خود اس کی اپنی نگاہ میں تھا۔

اور یہ سب کچھ تو وہ اس نادان کو بھی سمجھا چکی تھی۔
اور آج آبا کی ہستی اور ان کی دوستی پر اس کا اعتماد کچھ اور مضبوط ہو گیا۔

نیم گرم پانی کے غسل نے نہ صرف اس کے تن کو ہی بلکہ ذہن کو بھی بڑی آسوی
بخشتی۔ ہلکے پیازی لباس میں وہ خود کو بڑا تر و تازہ محسوس کر رہی تھی۔
بھیکے بھیکے بالوں میں برش پھیرتے ہوئے وہ پھر سوچوں میں کھو گئی۔ اور
اب۔ اس کی سوچوں میں صرف عدیل تھا۔
بڑی عجیب سی سوچیں تھیں۔ اس پر غصہ بھی نہیں تھا۔ ناراضگی بھی نہیں
تھی۔

کس قدر ضدی پن سے اس نے اپنی اتنی بڑی بات منوالی تھی۔ وہ نہیں
چاہتی تھی مگر پھر بھی جانے کیوں وہ مان گئی تھی۔ کیوں۔؟
بڑی دلفریب سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھرا تھی۔
”پاگل۔!“ اس کی بڑبڑاہٹ سے ہی جیسے پیار چمک رہا تھا۔

”با جی۔!“

کول نے چونک کر سر اٹھایا۔ فریج عجب عالم میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔
کول نے غور سے دیکھا۔

آنکھوں میں ایسی شعلوں کی لپک تھی جیسے ابھی سب کچھ جلا کر رکھ کر دیگی۔
”با جی۔!“ اس کی آواز میں کڑک کے ساتھ ساتھ غصے کی کپکپاہٹ بھی تھی۔

”کیا اتنی سچ کہتی ہیں کہ آپ اور عدیل۔“

جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔ کول کو منہ ہی آگئی۔

اس نے اپنی زندگی کا فیصلہ کیا تھا جس کا ہر انسان کو پورا حق حاصل ہے۔
پھر دوسرے لوگ اس اس انداز میں اس کے ساتھ کیوں پیش آرہے تھے۔؟
امی کے بعد اب فریج یوں آگ بگولہ ہوتی آئی تھی۔ عجیب سی بات تھی نا۔!
فریج کی کڑک کا اس نے بڑی نرمی بھری مسکراہٹ سے جواب دیا۔

”اے فری! امی نے ٹھیک کہا ہے۔“

اور کول کا یہ ٹھنڈا میٹھالبا ولہج فری کے تن بدن میں مزید آگ بھڑکا گیا۔
”مجھے تو پہلے دن سے ہی یہ بات کھٹکتی تھی کہ۔“

”کیا بات کھٹکتی تھی تمہیں۔؟“

کول کو بھی غصہ آگیا۔ فری اس کی چھوٹی ٹہن تھی۔ اسے اس کے ساتھ
اس انداز میں بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔

”یہی جو آپ عدیل پر دوسرے ڈال رہی تھیں۔“

ایسی بے ہودہ سی بات یوں واضح طور پر وہ اس کے منہ پر کہہ دے گی۔

یہ اسے توقع ہی نہ تھی۔

”فری۔!“ وہ بھی غصے میں کانپ اٹھی۔

”ہوش میں آؤ میں تمہاری بڑی بہن ہوں۔“

”میری کوئی بہن دہن نہیں۔“

”لیکن تمہیں آخر اتنا غصہ کیوں چڑھا ہوا ہے۔؟“

کول اپنے مزاج اور صلح پسند طبیعت کے مطابق جھٹ سے نرم پڑ گئی۔

”مجھے معلوم تھا کہ ان طویل ملاقاتوں اور سیر سپاٹوں کے پس پردہ آپ کا

مقصد کیا تھا۔؟“

”یہ تم کیا کہے جا رہی ہو۔؟“

”با جی! مجھے اتنی بیوقوف نہ سمجھو جتنی تم آج تک سمجھتی آئی ہو۔ مجھے اچھی

طرح علم ہے کہ کس طرح عدیل کو مجھ سے جدا کر کے تم نے اپنی طرف متوجہ کر لیا

ہے۔“

”یہ تم کیا بک رہی ہو۔؟“

وہ تو جیسے اس کی کچھ سن ہی نہیں رہی تھی۔ یا سننے کی جس ہی ختم کر بیٹھی

تھی۔ صرف بولنے کی اس میں قوت تھی۔

”خدا خبر اس کو کون کون سے سبز باغ دکھائے کہ وہی عدیل جو یونیورسٹی

میں سارا سارا دن میرے ساتھ رہتا تھا اب مجھ سے بات ہی نہیں کرتا۔ اور

یہ سب تمہاری وجہ سے ہے با جی۔! صرف تمہاری وجہ سے۔ تم نے میرا دوست

مجھ سے چھین لیا ہے۔ آخر آپ کو حق کیا پہنچتا تھا۔“

بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔

”فری! تم بالکل پاگل ہو۔ دوستی تو انسان کی ایک وقت میں ایک سے زیادہ لوگوں کے ساتھ ہو سکتی ہے۔“

کوئل بڑے ٹھنڈے لہجے اور دھیمی آواز میں بولی۔

”اور یہ تمہاری غلط فہمی ہے کہ میں نے اسے تمہاری طرف سے بدظن کر دیا ہے۔ کیا تمہارے خیال میں وہ بیک وقت ہم دونوں کا مشترکہ دوست نہیں ہو سکتا تھا۔؟“

”اور اگر یہی سوال میں آپ سے پوچھوں تو۔؟“

فریحہ اس طرح چمک کر بولی۔

”پوچھ سکتی ہو۔ میں جواب بھی دے سکتی ہوں۔ مگر اس وقت تم غصے میں

ہو فری۔! اور اس وقت تمہارے کان، تمہارا دل، تمہارا دماغ۔ سب غصے کے زہر سے لبریز ہیں۔ اس لیے اس وقت تمہیں کچھ بھی بتانا، سمجھانا بے کار ہے۔“

کوئل نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

”میں تو خیر جو سمجھوں گی وہ دیکھا جائے گا۔ مگر باجی! خدا کی قسم میں آپ

کو اتنا۔ اتنا۔ چالاک نہیں سمجھتی تھی۔“

یہ کہہ کر وہ اسی طرح شعلے برساتی آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے

واپس چلی گئی۔

کوئل مسکراتی۔

”کہنا کچھ اور چاہتی تھی۔ مگر نہ جانے کیوں رک گئی۔ شاید مجھے دلیل یا

نیچ کہنا چاہتی تھی۔

کیا میں واقعی ذلیل ہوں۔؟ کیا میں واقعی ایک نیچ حرکت کی ملکوتی ہوں۔؟ کیا ایک دوست کی خوشی پر اپنی زندگی، اصول، خوشیاں، سب کچھ قربان کر دینا واقعی ایک گھٹیا فعل ہے۔؟۔؟

اس کا ماقوف ذہن سمجھنے سے عاری تھا۔

معاً اس کے دماغ میں ایک خیال بجلی کا کوندا بن کر لپکا۔ اور اس کی روشنی میں گویا اسے سارے سوالوں کا جواب مل گیا۔

اں۔ شاید اس کا خیال صحیح تھا۔ شاید فری عدیل سے محبت کرتی تھی۔!

تبھی تو وہ اس قدر غصے میں تھی۔ تبھی تو وہ یوں بڑی بہن کے منہ لگ رہی تھی۔

یہ وہی جوش تھا۔ وہی جذبہ تھا۔

محبت۔! محبت۔!!

تو پھر۔ فری ٹھیک ہی کہتی تھی۔ وہ واقعی بڑی ذلیل تھی۔ بڑی نیچ تھی کہ اپنی

ہی بہن کی محبت کی راہ میں حامل ہوئی تھی۔

اسے اپنے وجود سے گھن آنے لگی۔ اسے اپنی ہی ذات سے نفرت سی محسوس

ہونے لگی۔ لیکن۔ فری نے آج تک اس بات کا اظہار کیوں نہ کیا۔؟

عدیل سے۔ یا خود اس سے۔

اس نے سب کچھ چھپا کیوں رکھا۔؟ اں شاید محبت جذبہ ہی ایسا ہے۔

دوسروں سے پوشیدہ رکھنا ہی پڑتا ہے۔ کہ ہمارے ملک میں کسی جوان لڑکی کا

کسی غیر مرد سے محبت کرنا گناہ کے مترادف ہوتا ہے۔

پھر۔؟ پھر اب کیا ہوگا۔؟ یا خدا۔ وہ کس دور ہے پر آن کھڑی ہوئی
مٹی۔ اور اب اس کو ایک کو چھوڑ کر دوسرے پر گامزن ہونا تھا۔

فری۔! یا عدیل۔!!

ایک کا دل رکھنے کو دوسرا توڑنا ہی پڑتا تھا۔ ایک چراغ بجھانے پر
ہی دوسرا جل سکتا تھا۔ کس کا دل توڑے۔؟ کس کا جوڑے۔؟

کون سا چراغ بجھائے، کون سا جلانے۔؟

وہ کیا کرے، وہ کیا کرے۔؟

دوزندگیاں اس کے لبوں کی ایک جنبش کے نازک دھاگے سے لٹک
رہی تھیں۔ اور نیچے ایک جہنم بھڑک رہا تھا۔

شکست خوردہ زندگی کا جہنم۔!

ناکام محبت کی آگ کا جہنم۔!!

اور ایک کو اس دوزخ میں عمر بھر جلنا تھا۔

عدیل کو۔؟

یا فری کو۔؟

اس کی وجہ سے۔ محض اس کی وجہ سے۔

یکدم ہی وہ خود کو مجرم محسوس کرنے لگی۔ اسے اپنے ہاتھوں سے خون ٹپکتا
محسوس ہونے لگا۔ کسی کی آرزوؤں کا خون۔! کسی کی حسرتوں اور تمنائوں کا

خون۔! فری کی۔!

یا عدیل کی۔!!

یہ فیصلہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ صرف اس کے ہاتھ میں۔

کسے عمر بھر کے لیے ناکام محبت کی آگ کے جہنم میں پھینک دے۔ کس
کی آرزوؤں اور حسرتوں کا خون کر دے۔

اور وہ خود۔

قاتل۔ مجرم۔!!

نہیں نہیں۔ وہ مجرم نہیں تھی۔ وہ قاتل نہیں تھی۔

بلکہ وہ تو خود مجبور ہو گئی تھی۔ تقدیر کے چکر نے اس کو بڑی بے دردی سے
جکڑ کر اس نازک مقام پر لا کھڑا کیا تھا۔

وہ بے قصور تھی۔ بالکل بے قصور۔!!

اور کوئی ایسا اپنا نہ تھا جو اسے مشورہ دے سکے۔ اسے تسلی دلا سکے

سکے۔ اس کا حوصلہ بڑھا سکے۔ اس کی بے گناہی پر یقین کر سکے۔ اور اسے
بھی یقین دلا سکے۔

کوئی بھی نہیں۔!

ایسا کوئی بھی نہیں۔!!

اور پھر اسے احساس ہوا کہ وہ کس قدر تنہا تھی۔ اس بھری دنیا میں تنہا۔!

عدیل کے وجود کے باوجود تنہا۔!!

شاید اس دنیا میں سبھی تنہا ہوتے ہیں۔ دوستوں، عزیزوں، ساتھیوں

ہم نفسوں کے ہوتے ہوئے بھی تنہا۔ بالکل تنہا۔!!

اس کو یوں لگا گویا وہ ایک لٹ و دق صحرا میں اکیلی کھڑی تھی۔ وہ جہاں تک نظر دوڑاتی۔ سونا پن ہی سونا پن تھا۔ نہ کوئی سایہ نہ ساتھی!!
تو یہ ہے انسان۔ اجتماعی زندگی گزارنے والا انسان۔ اس کو انسانیت کے لفظ پر ہی ہنسی آرہی تھی۔

آخری فیصلہ کرنے کے لیے بہت سوچ بچار کے بعد آخر اس نے یہی بہتر سمجھا کہ فری کے متعلق عدیل سے معلوم تو کرے کہ اس کے دل میں کیا تھا؟ کہیں کوئل خود دھوکے میں تو نہیں رکھی جا رہی تھی۔؟ کہیں فری کے ساتھ دھوکا تو نہیں ہو رہا تھا۔؟

ہر بات معلوم کر کے ہی اسے اگلا قدم اٹھانا چاہیے تھا۔ ابھی اس نے اس کے ساتھ شادی کا صرف وعدہ ہی کیا تھا۔ کہیں خدا نخواستہ ان کا عقد تو نہیں ہو گیا تھا۔

ابھی وقت تھا کہ سب کے جذبے بھی سلامت رہتے اور کسی کو گزند بھی نہ پہنچتا۔

پھر۔؟ کس طرح معلوم کرے۔؟

اور اب وہ یہ سوچ رہی تھی۔ راستے تو بہت تھے۔ عدیل کے گھر جاسکتی تھی۔ کہ اس کی اتنی سے اس کی جان پہچان تھی۔ یونیورسٹی جاسکتی تھی۔ فریجس کی بہن تھی۔ گھر بلا کر عدیل سے بات کر سکتی تھی کہ اس سارے شور شرابے کے باوجود اس پر ایسی پابندی اب بھی کوئی نہیں عائد کر سکتا تھا کہ آبا بے حد روشن خیال تھے۔

لیکن۔ لیکن۔ وہ عدیل کے رو در رو ایسی بات نہیں کر سکتی تھی۔ شاید وہ صحیح جواب بھی نہ دے سکتا۔

تب اسے خیال آیا۔ عدیل کے گھر میں فون لگا ہوا تھا۔ وہ فون پر اس سے بات کر سکتی تھی۔ سامنے بیٹھ کر کرنے کی بجائے فون پر تو زیادہ اچھے طریقے سے بات ہو سکتی تھی۔

ہاں۔ یہ ٹھیک تھا۔ یہ درست طریقہ تھا۔

شام کو وہ اتنی سے پوچھ کر مسز ربانی کے گھر چلی گئی۔

طالب علمی کے زمانے میں مسز ربانی کی بیٹی ریحانہ اس کی ہم جماعت ہو کر تھی۔ دونوں میں خاصا پیار تھا۔

پھر اچانک ہی ریحانہ کی شادی ہو گئی۔ لڑکا انگلینڈ میں تھا۔ فون پر ہی ریحانہ کا اس سے عقد ہوا اور وہ بغیر دولہا کے میکے کے گھر سے وداع ہو کر انگلینڈ سدھار گئی۔ دونوں یوں اچانک ہی بچھڑ گئیں۔

اور اب تین چار دن پہلے ہی اسے اطلاع ملی تھی کہ وہ چار سال کے بعد دو بچوں کے ساتھ اپنے والدین سے ملنے آئی ہوئی تھی۔

گول ابھی تک اسے ملی نہیں تھی۔ پچھلے دنوں وہ خود اتنی پریشان رہی تھی کہ جانے کا موڈ نہ بنا۔ اب بھی اس سے ملنے کے علاوہ گول کا اصل مقصد عدیل کو فون کرنا تھا۔

وہ جب سے گئی تھی ان میں تو خط و کتابت بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے باوجود ریحانہ اسے بڑے تپاک سے ملی۔

متعلق سوچتی رہی۔ کہ وہ صرف ایک عورت پر قناعت کیوں نہیں کر سکتا۔
شادی کے بعد۔ بے شک محبت کی شادی کیوں نہ ہو۔ وہ پھر بھی دوسری
عورتوں کی طرف کیوں کھینچتا ہے۔ اس کی اپنی بیوی، خواہ لاکھوں میں ایک ہو۔
اس کی کشش شوہر کے لیے ختم کیوں ہو جاتی ہے۔؟

انہیں سوچوں میں کھوئے کھوئے اس نے چائے پی۔ پھر اٹھ کر آنے لگی تو
اسے یاد آگیا کہ اس کا بھی ایک مسئلہ تھا۔ اتنی دیر سے وہ خود کو بھولی ہوئی تھی۔ ریکھا
کی داستان ہی ایسی تھی کہ اسے کچھ یاد ہی نہیں رہا تھا۔

اور اب۔ جانے کیوں اس کا دل عدیل کو فون کرنے کو بھی نہیں چاہ رہا
تھا۔ کہ وہ بھی ایک مرد تھا۔ ایسا ہی مرد۔

لیکن۔ نہیں نہیں۔ یہ تو عدیل تھا۔ بھولا بھالا اور محصوم سا۔ اور ساتھ
فری کا معاملہ تھا۔ وہ اس سے شادی کا وعدہ کر چکی تھی۔ کہیں فری کی زندگی
نادائستگی میں خراب نہ ہو جائے۔

تب چلتے چلتے بادل خواستہ اس نے ریکھا سے ان کا فون استعمال کرنے
کی اجازت لی۔

پہلے کبھی اس نے فون پر عدیل سے بات نہیں کی تھی۔ اتنا اس سے بے تکلف
تھی۔ مہینوں کی اس سے ملاقات تھی۔ زندگی ساتھ گزارنے کا اتنا بڑا فیصلہ وہ
کر چکے تھے۔

مگر جانے کیوں۔ اس وقت کوئل کا سارا وجود لرز رہا تھا۔
شاید کسی خدشے کے تحت۔ یا پھر اس شرم و حیا کے جذبے کے تحت۔

مگر کوئل کو اسے دیکھ کر زبردست دھچکا لگا۔ یہ تو وہ ریکھا ہی نہیں تھی۔
سرخ و سفید گداز سے جسم والی ریکھا انتہائی زرد اور دہلی سی ہو رہی تھی۔

کوئل کے استفسار پر اس نے اپنی اتنی سے چوری چوری اپنی دکھ بھری داستان
چپکے چپکے اسے سنا ڈالی۔ کہ جس انسان کے ساتھ اس کے ماں باپ نے اس کی
شادی کی تھی وہ صرف تصویر پر ہی خوبصورت تھا۔ صرف شکل و صورت کے لحاظ
سے۔!

ورنہ اس کی سیرت، اس کے گنوں نے تو ریکھا کو اس حال تک پہنچا دیا کہ
اب وہ ہر لمحہ اپنی موت کی دعائیں مانگ رہی تھی۔

ایک شادی اس کی پہلے ہو چکی تھی جس کا یہاں کسی کو علم ہی نہیں تھا۔
پھر جب ریکھا نہ بیاہ کر گئی تو گوہلی بیوی سے وہ تعلقات منقطع کر چکا تھا مگر
پھر بھی اسے معلوم ہوا تو اس نے اس پر مقدمہ کر دیا۔

بڑی دیر تک مقدمہ چلتا رہا۔ پھر اس انگریز عورت نے طلاق تو لے لی مگر
ساتھ ہی انہیں کوڑی کوڑی کو محتاج کر گئی۔ اس کے دو بچے تھے اور اب بھی
ایک خطیر رقم بچوں کے لیے قانونی طور پر ان کی آمدن میں سے ہر ماہ علیحدہ کر لی
جاتی تھی۔

ریکا اور اس کے بچوں کے لیے جو کچھ بچتا اس میں سے بھی زیادہ اس کے
شوہر کے شراب کے بلوں کی ادائیگی پر اٹھ جاتا کہ اتنی پریشانیوں میں اسے سکون
کی ضرورت تھی۔ اور سکون صرف شراب سے ہی حاصل ہوتا ہے۔

ریکا بہت دیر روتی رہی۔ اور کوئل مرد کی سیما ب صفت فطرت کے

کہ اس فیصلے کے بعد عدیل کے ساتھ اس کی پہلی گفتگو تھی۔ اور یا۔ یا پھر ریحانہ کی داستان کا اثر تھا۔

کچھ تھا ضرور۔ اس پر عجیب سی کپکپی طاری ہوئی جا رہی تھی۔

اتفاق ہی تھا نا۔ فون عدیل نے خود ہی رسیو کیا۔ اس کے پوچھنے پر بتاتے ہوئے اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے کہ اس سے بات کرنے والی کون تھی۔ اور کون کا نام سنتے ہی عدیل نے کچھ اس انداز میں خوشی و مسرت کا اظہار کیا کہ لمحہ بھر کے لیے کونل کے دل میں یہ خیال آیا کہ عدیل کے جذبات جھوٹے نہیں ہو سکتے تھے۔

وہ اس سے یا فریحہ سے کسی قسم کا دھوکا یا فریب نہیں کر رہا تھا۔

مگر دوسرے لمحے داغ نے اس فرض کا بھی احساس دلایا جو ایک بہن کے رشتے سے اس پر عاید ہوتا تھا۔ تب وہ بڑی سنجیدگی سے بولی۔

”عدیل! میں تم سے ایک سوال پوچھ رہی ہوں۔ امید ہے جواب دیتے وقت تم سچائی کا دامن نہیں چھوڑو گے۔“

”یہ کس بات کی تمہید باندھی جا رہی ہے۔؟“

”عدیل! تمہاری زندگی میں آج تک کوئی دوسری لڑکی آئی ہے یا نہیں؟“
کونل نے اس کے مذاقیہ لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے صاف بات کر دی۔

”کسی لڑکی نے آج تک تم سے محبت کی ہے۔؟“
کچھ دیر کی خاموشی کے بعد عدیل کی آواز آئی۔

”گوئیں تمہارے اس سوال کی وجہ تو نہیں سمجھا مگر پھر بھی میرا جواب حاضر ہے کہ آج تک کسی لڑکی سے میں نے اور شاید مجھ سے کسی لڑکی نے پیار نہیں کیا۔“
”عدیل! اچھی طرح سوچ لو۔ اس کا ہماری آئندہ زندگی پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔“

”ہاں جان۔! میں سچ کہہ رہا ہوں۔ تم میری زندگی میں آنے والی پہلی اور آخری لڑکی ہو۔“

”تو کیا۔۔۔“ مگر وہ اچانک خاموش ہو گئی۔

اس کا یہ لہجہ، یہ انداز۔!! خلوص، محبت، اپنائیت، اعتماد، سبھی کچھ تھا اس میں۔ پھر۔ کچھ اور کہنے سننے کی گنجائش کب رہ گئی تھی۔!!
”اچھا خدا حافظ۔!“

یکدم اس نے فون بند کر دیا۔ اس کے پکارنے کی آواز بھی کونل کو آئی تھی مگر اس نے دانستہ ایسا کیا۔

اس کے پوچھنے پر وہ کیا جواب دیتی کہ وہ اس قسم کے سوالات کیوں کر رہی تھی۔؟

اسے یقین ہو چکا تھا کہ عدیل نے اس کے ساتھ سچ بولا تھا۔ تو گویا وہ فریحہ کے جذبات سے ناواقف تھا۔

ان دونوں کے درمیان ایسا کوئی تعلق، کوئی واسطہ نہ تھا۔ ایک دوسرے کے لیے فی الحال وہ صرف ہم جماعت تھے یا صرف دوست۔

اور اس صورت میں اس کو یہ بتا دینا کہ فری اس کو اپنے دل میں بسا

چکی تھی، بہت نقصان وہ تھا۔ بلاوجہ اس کی پریشانیوں میں اضافے کا باعث بننا تھا۔

کیونکہ۔ کومل جانتی تھی کہ عدیل اب اسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ عدیل کے انداز سے جس قدر گہری اور بے پایاں محبت اسے اپنے لیے محسوس ہوتی تھی، جس طرح وہ اسے حاصل نہ کر سکنے پر اپنی جان بھی دے دینے کو تیار تھا۔ اپنے آپ کو تباہ کر دینے پر تیار ہوا تھا۔ اس کا تقاضا تو یہی تھا۔ پھر۔؟ پھر کیا فریجہ کو سدا محرومی کی آگ میں جلنا تھا۔ اسے اپنی پوشیدہ محبت کا اندر ہی اندر کلا گھونٹ دینا تھا۔

بڑی پریشانی کی بات تھی۔ بڑے دکھ کی بات تھی۔ بے انتہا تکلیف وہ تھا سب کچھ۔

مگر۔ وہ بھی تو کچھ کر سکتی تھی۔ اگر اسے ذرا سا بھی شک ہوتا کہ اگر عدیل سے شادی نہ کرے گی۔ تو اس نے فریجہ کا ہو جانا تھا۔ تو اس صورت میں وہ یقیناً عدیل کو انکار کر دیتی۔

اسے فریجہ بھی بہت عزیز تھی۔ وہ اس کی بہن تھی۔ اس کا اپنا خون۔!! وہ اس کی خاطر اپنی محبت تک کی قربانی دے سکتی تھی۔

مگر یہاں تو معاملہ دوسرا اور انوکھا سا ہو چکا تھا۔ نہ محبت کی بات تھی نہ کچھ۔ وہ تو بس ایسے ہی بندھ گئی تھی۔

عدیل سے وہ شادی نہ کرتی تو اس نے خود کو تباہ کر لینا تھا۔ یا شاید جان سے ہی گزر جاتا۔ فری کا تو وہ پھر بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

عدیل کے ساتھ شادی سے انکار کی صورت میں دو زندگیاں تباہ ہونا تھیں۔ اور تب۔ اس نے دل ہی دل میں یہی فیصلہ کیا کہ وہ خاموش رہ کر دونوں کی آرزوؤں اور حسرتوں کا خون ہونے کے بجائے صرف ایک کا ہونے دیگی۔ ایک زندگی کو بچالے گی۔

اور اس بات کا اسے بے حد دکھ اور صدمہ ہوا کہ بچنے والی زندگی اس کی بہن کی نہ تھی۔ عدیل کی تھی۔ جو۔ جو۔

نہیں۔ نہیں۔ وہ بھی تو اس کا دوست تھا۔! عزیز ترین دوست۔!! ان چھ آٹھ ماہ کی ملاقات میں کومل کو اس نے اتنا خلوص دیا تھا کہ فریجہ کی بیس سالہ رفاقت نے بھی نہ دیا ہوگا۔

تب اسے فری پر بہت رحم آیا۔ اس کے لیے اس کا دل بہت دکھا۔
"کاش! فری میں تمہارے لیے کچھ کر سکتی۔!"

وہ بے حد مجبور تھی۔ اور بہت بے بس۔!!

مدارات کی جاتی۔ بڑا خیال رکھا جاتا۔

یوں بھی عدیل کے اپنے اچھے عادات و اطوار اور سلجھے ہوئے مزاج کی وجہ سے امی اور آبا دونوں ہی اس سے دلی طور پر محبت کرنے لگے تھے۔ کومل کے رشتے کے علاوہ۔!

وہ آتا تو امی اسے اپنے پاس بٹھاتیں۔ بڑی اچھی طرح اس کی خاطر تواضع کرتیں۔

ابا اس کے مستقبل کے متعلق بڑی دلچسپی سے پوچھ گچھ کرتے اور مشورے دیتے۔ اس کی سعادت مندی اور فرمانبرداری کی وجہ سے وہ تو انہیں اپنا بیٹا ہی محسوس ہونے لگا تھا۔

اکثر اس کی غیر موجودگی میں امی سے اس کی باتیں کرتے رہتے۔ اس کی اچھی عادات کی۔ اس کے نکھرے سحرے چال چلن کی۔ اور اب۔ ان کا یہ خیال تھا کہ کومل واقعی عقل مند تھی۔ شریک حیات کے لیے عدیل کا انتخاب کر کے اس نے بڑی دانشمندی کی تھی۔

امی اور آبا خوش تھے۔ اس کا اندازہ کومل کو بخوبی ہو چکا تھا۔ البتہ فریج کے متعلق وہ کوئی رائے قائم نہیں کر سکی تھی۔

پہلے دن تو وہ بے حد آگ بگولہ ہوئی تھی۔ اس کے بعد۔ شاید اس نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ بس خاموش ہی تھی۔

ویسے بھی کومل کے سامنے اس کی اور عدیل کی کبھی ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی جس سے وہ کچھ اندازہ کر سکتی۔

وقت کا پہلیا اپنی نارمل رفتار سے چلتا رہا۔ عدیل کے ساتھ اس کی ملاقات کم ہی ہوتی۔

گواہ ان دونوں کی باقاعدہ منگنی ہو چکی تھی۔ مگر شادی سے پہلے لڑکی لڑکے کا آپس میں بے تکلفی اور زیادتی سے ملنا کومل کو پسند نہ تھا۔

عدیل نے اس کی اس پسند کو بھی ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے ہاں آنا جانا تقریباً بند کر دیا تھا۔

جب کبھی اس کے بغیر جی بہت زیادہ بے قرار ہوا اٹھتا تو اسے ایک نظر دیکھنے کی خاطر امی کے ساتھ گھنٹہ دو گھنٹہ کے لیے ان کے ہاں چلا جاتا۔

کومل کی امی اور آبا اب عدیل کے ساتھ اسی طرح پیش آتے جس طرح کوئی ساس سسر اپنے ہونے والے داماد کے ساتھ۔ اب اس گھر میں اس کی بڑی خاطر

عدیل جب کبھی ان کے ہاں آتا تو وہ یا کبھی کسی سہیلی کے ہاں ہوتی کہ اس کی اکثر شا میں گھر سے باہر سہیلیوں کے گھروں میں ہی گزرتی تھیں۔ اور یا کبھی کبھار گھر میں ہوتی بھی تو پڑھائی کے لیے اپنے کمرے میں ہی گھسی رہتی۔ البتہ یونیورسٹی میں نجانے وہ ایک دوسرے سے کیسے ملتے تھے۔ اس کا کوئل کو کوئی علم نہ تھا۔ ویسے انداز سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہاں بھی کبھی کوئی ایسی بات نہیں ہوتی ہوگی۔ اگر ہوتی تو عدیل سے اسے پتہ چل جاتا۔ عدیل نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ پہلے ماں اور باپ کی زبردستی سے ہی وہ تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ ذہن اچھا تھا جو ہر امتحان میں بغیر محنت اور تیاری کے تیسرا درجہ ہی لے کر پاس ہو جاتا رہا تھا۔ مگر اب تو اس کے سامنے اس کی منزل تھی۔ اس کی خاطر اس نے دن رات ایک کر دیا۔ خوب محنت کی۔ خوب دل لگا کر پڑھائی کی۔ اس کی ماں خوش تھی۔ اس کا باپ خوش تھا۔ سینکڑوں ڈیڑھ میں اس نے ایم اے پاس کر لیا۔ پہلی ہی کوشش میں۔! ورنہ جس طرح وہ دوستوں اور تفریحات میں وقت گزارا کرتا تھا اس سے تو انہیں اس کے کامیاب ہونے کی بھی اُمید نہ تھی۔ ان کی نگاہ میں کوئل کا وجود بڑی برکت اور رحمت والا تھا کہ ان کا کلوتا بیٹا انسان بن گیا تھا۔ ایم اے کے بعد اعلیٰ ملازمتوں کے امتحان میں بھی وہ پہلی ہی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔

دونوں گھروں میں بڑی خوشیاں منائی گئیں۔!! عدیل نے تین سال کوئل سے مانگے تھے۔ اور جب تین سال پورے ہوئے تو وہ ٹرننگ وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنی ملازمت پر لگ چکا تھا۔ کوئل کے ماں باپ اور عدیل کے والدین کی خواہشات کے باوجود اسے لاہور میں نوکری نہ مل سکی۔ وہ پنڈی تعینات ہوا۔ اچھی ہی جگہ تھی۔ کم از کم لاہور کی نسبت وہاں گرمی تو کم پڑتی تھی۔ تسلی کے لیے گو صرف یہی ایک جواز تھا۔ مگر پھر بھی ماں باپ نے خوشی خوشی اسے بھیج دیا کہ ان کا بیٹا ایک بڑا افسر تھا۔ دونوں طرف سے بڑے زور شور سے شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ عدیل والدین کا اکلوتا بیٹا تھا اور کوئل اپنی ماں اور باپ کی بے حد فرمانبردار ذہین، سمجھدار اور قابل فخر اولاد تھی۔ اس کے ساتھ دونوں ہی کو فریج کی نسبت بہت زیادہ پیار تھا۔ بہت زیادہ محبت اور بہت زیادہ مان و بھروسہ۔!! پوری زندگی میں اس نے صرف شادی کے مسئلے پر ہی ماں باپ کی نافرمانی کی تھی۔ پہلے کچھ عرصہ بلاوجہ ہی انکار کرتی رہی اور پھر۔ عدیل کے ساتھ شادی کا ارادہ۔! مگر یہ بھی اس کی خوش قسمتی تھی کہ عدیل کو طے جلنے کے بعد وہ ان کی عین تمنا اور خوشی بن گیا تھا۔ ایک بیٹی کے والدین اپنی لائق اور سمجھدار بیٹی کے لیے جس قسم کا براہ چاہ

سکتے ہیں وہ عین بین ان کی خواہشات پر پورا اُترتا تھا۔ اس طرح۔ اس کی یہ نافرمانی بھی نافرمانی نہ رہی تھی۔

یوں۔ یہ شادی بڑے خلوص بڑے چاؤ اور بڑی تمناؤں کے ساتھ چلی۔ دونوں طرف سے پورے حوصلے نکالے گئے۔ ایسے۔ کہ کم ہی ایسی شادی دیکھنے میں آئی ہوگی۔

ڈھولک! بابے گاجے، رت جگے، مہندی، چھوٹی چھوٹی خوبصورت سی رسمیں۔ نازک سی پیاری سی دلہن، بڑا لائق، سمارٹ اور وجاہت بھری شخصیت والا دولہا، اچھے اچھے خوش لباس و خوش مزاج معزز براتی اور براتیں اور کھرے سٹھرے اور خوش ذوق دلہن والے لوگ۔

سب کچھ نفیس تھا اور سب کچھ ہی بہت اعلیٰ!

بڑی قسمت والا دولہا تھا جسے کوئل ایسی اچھی عادات والی دلہن ملی تھی۔ اور بڑے مقدر والی دلہن تھی جسے عدیل جیسا خوب رو اور اتنا لائق دولہا ملا تھا۔ شادی میں شامل ہونے والے ہر ایک کی یہی رائے تھی۔ اور۔ بخیر و خوبی عدیل اور کوئل کی شادی انجام پاگئی۔

ہنستے ہنستے بے حال ہوتے ہوئے کوئل مسہری پر دراز ہو گئی۔ عدیل کرسی سے اٹھ کر اس کے پاس جا بیٹھا۔

”پلیز! اور مت ہنسنا۔ اب مجھ میں ہنسنے کی مزید ہمت نہیں۔“ وہ ہنس رہی تھی۔ ہنسی کی زیادتی سے آنکھیں نم آؤد ہو گئی تھیں۔ انہیں پونچھ رہی تھی۔

عدیل نے اسے بازوؤں میں بھر کر سینے کے ساتھ بچھ لیا۔

”کیوں ہنسنے کی ہمت نہیں۔؟“

”اس لیے۔ اس لیے۔“

اس کے بازوؤں کا حلقہ اتنا تنگ تھا کہ کوئل کو سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ بات کیسے کرتی۔

”کس لیے؟“

عدیل اس کے رخساروں پر کھلتے گلہلوں کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔
”اس لیے۔“ کوئل نے بات شروع کی۔

عدیل نے شرارت سے پھر اسے سینے کے ساتھ بھینچا۔ بات پھر وہیں
رک گئی۔

”اس۔۔۔“

اس نے بولنے کی پھر کوشش کی مگر آواز نہ نکل سکی۔

”بس! اتنی بہادر ہو۔؟“

”اس میں۔۔۔“

عدیل نے اس کے ہونٹوں پر اپنے دہکتے ہونٹ رکھ دیئے۔ اور۔ بات
پھر ادھوری رہ گئی۔

کوئل نے قدرے جھنجھلا کر نگاہ اٹھائی۔ عدیل کی آنکھوں میں پیار کا اتھا
ساگر تھا۔ وہ اس کی گہرائیوں میں ڈوب سی گئی۔

غیر ارادی طور پر اس کے بازو اٹھے اور عدیل کے گلے میں جامل ہو گئے۔

عدیل: اس کا اپنا عدیل۔!!

جس کے مضبوط بازوؤں میں اس کی پناہ گاہ تھی۔ جس کے سینے میں
اس کی محبت کا جہاں آباد تھا۔ جس کی آنکھوں میں ہمہ وقت اس کا وجود
موجود رہتا تھا۔!

جس کے دل میں وہی دھڑکتی تھی۔!

جس کے ہونٹوں پر وہی رقصاں تھیں۔!
غرض۔ اس کے اندر، باہر، دل میں، دماغ میں، زبان پر، آنکھوں
میں۔ وہی وہ تھی۔!!

اور خود عدیل کا وجود جیسے کہیں تھا ہی نہیں۔

یہ زندگی جس میں حسن ہی حسن تھا۔ سکون ہی سکون تھا۔ اطمینان ہی
اطمینان تھا۔ اور۔ محبت، چاہت، خلوص، آرزوؤں، ولولے، شوق، جذبات،
خوشی، اعتماد۔ یہ سب۔ یہ سب۔ اس کے لیے تھا۔ اس کا تھا۔!!

سارا جہاں اس کا تھا۔ سارے عالم کی خوشیاں اس کے لیے تھیں۔!!!

جس دلچسپی، شوق اور خوشی سے لڑکیاں دلہنیں بنتی ہیں۔ جب وہ
دلہن بنی تھی۔ تو کوئی ارمان، کوئی ایسا جذبہ اس کے اندر نہ تھا۔

صرف ایک خیال تسکین بخش تھا کہ اس نے اپنی انگلیں، اپنی آرزوؤں،
اپنی خواہشیں دے کر ایک زندگی تباہ ہونے سے بچالی تھی۔ بس۔!

اپنے ہونے والے دولہا کے لیے اور کسی قسم کے جذبات اس کے سینے میں
نہ تھے۔ بہت کبھی کبھی سی تھی وہ۔!

مگر۔ مگر۔ یہ گزرنے والے آٹھ نو مہینے۔ یہ جیسے کسی خواب و خیال کی دنیا
میں رہ کر اس نے گزارے تھے۔

وہ جس عدیل کو جانتی تھی۔ یہ وہ عدیل تو تھا ہی نہیں۔!

وہ کھلنڈ راسا، جذباتی سالگرہ کا تھا۔

اور یہ عدیل، جس کے ساتھ اس کی شادی ہوئی تھی۔ یہ تو کوئی اور ہی تھا۔

اس سے بالکل مختلف :-

اس کا ذہن، اس کی سوچیں، اس کی ہر بات، ہر کام، جیسے سب اس کے اپنے ہی دماغ سے نکلتا تھا۔

ایسے ہی شریک زندگی کے اس نے سنے دیکھے تھے۔ ایسے ہی ٹوٹ کر محبت کرنے والے شوہر کی اس نے تمنا کی تھی۔ ایسے ہی ہم ذوق ساتھی کے ساتھ کی اس نے ہمیشہ خواہش کی تھی۔

ایسا ہی گھر اس کے تخیل نے سجایا سنوارا تھا جیسا اس نے اسے دیا تھا۔ چھوٹا سا، سُتھرا سا، امارت سے نہیں، سکون و اطمینان سے مہکتا مسکراتا جہاں دولت سے زیادہ محبت تھی۔

ایک دوسرے کے لیے ارمان تھے اور خلوص تھا اور اعتماد تھا۔ یہ عدیل۔ یہ تو اس کا وہی آئندہ تھا جس کی خاطر اس نے بے شمار رشتے ٹھکرا دیئے تھے۔

یہی اس کا آئندہ تھا :-

یہ گھر :- یہ زندگی :- یہ زندگی کا ساتھی :-

یہی سب اس کا آئندہ تھا :-

اسی کی ہمیشہ اس نے تمنا کی تھی۔ یہی اس نے چاہا تھا۔

اور۔ بے خود ہو کر عدیل کے سینے میں اس نے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

”میری زندگی :- میری رُوح :-“

عدیل نے وارفتہ ہوتے ہوئے اپنے اندر لبالینے، چھپا لینے کے انداز

میں اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔

”میں بہت خوش نصیب ہوں کہ تمہیں پالیا۔ بس :- اب مجھے اور کوئی تمنا

نہیں۔ کوئی خواہش نہیں۔ تم ہی میرا سب کچھ ہو۔ تم ہی میری منزل ہو۔“

وہ اسے اناٹہ حیات کی طرح اپنے بازوؤں میں سمیٹے بڑبڑاتا تھا۔

اور کول کو محسوس ہوا جیسے یہ اس کی اپنی ہی آواز تھی۔ اپنی ہی صدا :-

وہ اپنے ہی دل کی دھڑکنیں سن رہی تھی اور اپنی ہی آواز اس کے کانوں

میں گونج رہی تھی۔

خوشی رقص کر اٹھی۔ پیار جھومنے لگا۔ اور ساری کائنات مسکرا دی۔

خوشگوار تھیں۔؟؟

انتہائی دلفریب انداز میں اس کے یا قوتی لب مسکرا رہے تھے۔ چہرے پر کچھ ایسی رونق، ایسی تازگی تھی کہ پہلے کبھی کم ہی دیکھنے میں آئی تھی۔ وہ جھک کر بڑی دلچسپی اور وارفتگی سے اسے گھورنے لگا۔ یہ اس کے چہرے کی پاکیزگی۔ یہ اس کے چہرے کی پروقار سنجیدگی۔ اس قسم کا زہد و تقویٰ لوٹ لینے والا اس کا حسن۔ اس انداز میں پہلے اس کی نگاہ میں کبھی نہیں آیا تھا۔

جانے یہ اس کا کون سا روپ تھا۔؟
عدیل اپنے انتخاب پر آپ ہی فخر کر اٹھا۔
نجانے اس کے ذہن میں کون سی سوچ تھی۔ کومل کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔ لبوں پر بجلیاں ترپ اٹھیں۔
اور۔ بجلیوں کی یہ ترپ عدیل کا صبر و قرار بالکل ہی راکھ کر گئی۔ جھک کر اس نے ان بجلیوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔
”اے۔“ کومل چونک کر سیدھی ہو گئی۔
”تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔“

”یہ میری جان اکیلے اکیلے خیالات کے کس لالہ زاروں کی سیر کر رہی ہے؟“
عدیل نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اسے اپنے بازوؤں میں بھر کر آغوش میں کھینچ لیا۔

”ہوں۔ تو کیا سوچ رہی تھیں۔؟“

چپ چاپ بیٹھی اپنے خیالات میں محو کومل جلد جلد کچھ بٹن رہی تھی۔ سفید مہین سی ساڑھی کے ڈھکے ہوئے پلو میں سے اس کا چاندنی ایسا خوبصورت بدن کہیں کہیں سے دکھائی دے رہا تھا۔

مگر وہ کچھ ایسی کھوئی ہوئی تھی کہ اسے احساس ہی نہ تھا۔ ہاتھ بڑی تیزی سے چل رہے تھے۔ اور اسی تیزی سے خیالات بناغ میں چکر لگا رہے تھے۔
اسے پتہ ہی نہ چلا کہ عدیل اندر آیا اور کب سے وہ اس کے پیچھے کھڑا اس کی محویت کو دیکھ رہا تھا۔؟ اسے بالکل علم نہ تھا۔

شاید تھک گئی تھی۔ یکایک سلائیاں گود میں رکھ کر صوفے کی پشت کے ساتھ سر ٹیکتے ہوئے اس نے آنکھیں موند لیں۔

سوچیں کچھ اور گہری ہو گئیں۔ جانے کیا تھیں۔؟ کون سی تھیں۔؟ کس قدر

”ایک بات۔“ وہ عجیب انداز میں مسکرائی۔

آنکھوں میں کہکشاں اُتر آئی۔

”میرے متعلق۔؟“

اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”ہوں۔؟ ہاں۔ نہیں۔“

”کیا۔؟ میرے علاوہ بھی کوئی سوچ تمہارے ذہن میں آسکتی ہے۔؟“

”وہ۔ ایک۔“

جاننے کیا بات تھی۔؟ وہ کچھ شرمناک رہی تھی۔ ہچکچا رہی تھی۔

عدیل چونکا۔ کومل کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر غور سے اسے تکتے لگا۔

”سچ سچ بتاؤ۔ یہ آج کل تم۔“

اور وہ بات بھی پوری نہ کر سکا۔ کومل کے چہرے کا انوکھا سا روپ اسے

مدہوش کیسے دے رہا تھا۔

اس کی آنکھوں کی نرالی سی چمک اس پر عجیب سا سحر طاری کیسے دے رہی

تھی۔

”جان۔! یہ تم آج کل کون سا میک اپ کرنے لگی ہو۔؟“

عدیل نے بے قراری سے اس کی آنکھیں چوم لیں۔

”میک اپ۔؟ کوئی بھی تو نہیں۔“

کومل اپنے چہرے کو ہاتھوں سے رگڑنے لگی۔ ہاتھوں کی رگڑ سے اس کے

رخسار کچھ اور سُرخ ہو گئے۔ ساتھ ہی عدیل کی وافتگی اور پیار میں ڈوبی نگاہوں

نے اس کے چہرے میں جیسے انگارے سے بھر دیئے۔ وہ اور بھی دکھ اٹھی۔

”پھر۔؟ پھر کیا ہے یہ۔؟“

”کیوں۔ کیا ہوا ہے۔؟“

عدیل کی گہری گہری نگاہوں سے وہ آنکھیں چرانے کی کوشش کر رہی

تھی۔

”جاننے کیوں تم کچھ دنوں سے مجھے ہمیشہ سے بہت زیادہ مختلف لگ

رہی ہو۔“

”بڑی خراب۔؟“

وہ شوخی سے مسکرائی۔ گویا دونوں عالم مسکرا اُٹھے۔

”خراب۔؟“ عدیل بے قرار ہو گیا۔

”ہاں بہت۔“

اور پھر جس انداز میں اس نے اسے بازوؤں میں بھر کر بہت سارے

پیار کر ڈالے تھے اس سے کومل کو احساس ہو گیا کہ عدیل کے من میں اس

وقت کس قسم کے جذبے مچل رہے تھے۔

تب۔ کومل نے چپکے سے، ہولے سے، اس کے کان میں کچھ کہہ دیا۔

بہت شرمناک، بہت لجا کر، پہلے سے بھی زیادہ حسین ہو کر۔!!

”کیا سچ۔؟؟“ عدیل چونکا۔

پھر۔ اسی کے سے محبوب انداز میں ہولے سے اس کے کان میں بولا۔

”کیا تم بہت خوش ہو۔؟“

”اے۔ بے حد۔ کہ نسوانیت کی تکمیل ہی اسی طرح ہوتی ہے۔ تمہارے اور میرے پیار کا جیتا جاگتا ثبوت۔ ہماری محبت۔۔۔“
اور عدیل نے اس کا فقرہ بھی پورا نہیں ہونے دیا۔ اپنے ہونٹوں سے اس کے ہونٹ بند کر دیتے۔

”تسبی۔ تسبی تم آج مجھے اور ہی رُوپ میں دکھائی دے رہی ہو۔ ماتا کا مقدس روپ۔! بخدا تمہارا ہر روپ حسین اور بے مثال ہے۔ تمہیں خوش دیکھ کر میری خوشی پاگل ہوئی جا رہی ہے۔ تمہاری تکمیل میری تکمیل ہے کہ۔“
”بس۔!“ کوئل نے شرم کر اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

اور عدیل نے بڑی عقیدت، بڑے احترام سے اس کا ہاتھ چوم لیا۔ وہ تخلیق کے ایسے مرحلے سے گزر رہی تھی کہ جہاں ملائیک بھی عورت کے حضور احترام سے جھک جاتے ہیں۔!!

پیاری امی

تسلیمات۔!

پچھلے ایک مہینے میں آپ کو دو خط لکھ چکی ہوں۔ مگر ابھی تک جواب سے محروم ہوں۔ خدا کرے آپ بخیریت ہوں۔

آج کل یہاں کافی گرمی پڑ رہی ہے۔ چند دن تک میں اور عدیل مری جا رہے ہیں۔ ایک تو گرمی کی وجہ سے۔ دوسرے اس لیے کہ آج کل میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں رہتی۔ مگر پریشانی کی کوئی بات نہیں۔

آج کل تو لاہور میں بھی موسم کافی گرم ہو گا۔ پنڈی سے بھی زیادہ۔ اس لیے اگر آپ، آبا جان اور فری میرے پاس مری آجائیں تو کتنا اچھا ہو۔ آبا جان اتنی محنت کرتے ہیں۔ یہاں کچھ آرام کر لیں گے۔

تو کیا ہوگا۔؟

اس کی صرف اپنی ہی نہیں تینوں کی زندگیاں ایک ایسے طوفان میں
پھنس جانا تھیں جس کے تصور سے ہی وہ لرز اٹھتی تھیں۔

پھر بڑی شکل سے اس نے اپنے دل کو سمجھایا۔

”نہیں۔ فری اتنی گری ہوئی لڑکی نہیں۔ اگر کسی زمانے میں اس کو
عدیل کے ساتھ لگاؤ تھا بھی تو کیا ہوا۔؟ جذبات کے ایسے طوفان اس عمر میں
آیا ہی کرتے ہیں۔ مگر ان کے اثرات کبھی دیرپا نہیں ہوتے۔“
اور پھر یکدم اسے خود پر سنسی آگئی۔ اور اپنے خیالات، اپنی ذہنیت
پر افسوس۔!

عدیل ایسا تو نہ تھا۔ وہ جو دن رات اس کی محبت کے نغمے الاپتا تھا۔ جو
اس کی پرستش کرتا تھا۔ جو اسے دیوانوں کی طرح چاہتا تھا۔
وہ بھلا اسے دغا دے سکتا تھا۔ یہ ناممکن تھا۔ قطعی طور پر ناممکن۔!!
اس کے دل میں تو فری کے لیے کچھ نہ تھا۔ اس کے دل میں تو وہی وہ تھی۔
پھر یہ سب خدشے کیوں۔؟

عدیل کے متعلق ایسی بے اعتمادی لمحہ بھر کے لیے بھی وہ دل میں لائی کیوں؟
کیوں لائی۔؟؟

اپنے ہی خیالات کو ملامت کرنے کے بعد دونوں کے لیے اعتماد کا ثبوت
دیتے ہوئے اس نے خط پوسٹ کر دیا۔

عدیل کو بھی آپ سب سے بڑی شکایت ہے کہ ہماری شادی کو ایک
سال ہو گیا ہے مگر آپ میں سے ابھی تک کوئی بھی ہمارے گھر نہیں آیا۔
دیکھیے انکار نہ کیجیے گا۔ آپ کی آمد تک میں پنڈی میں ہی رہوں گی۔
پھر اکٹھے ہی سب مری جائیں گے۔
عدیل کی طرف سے سب کو سلام۔

آپ کی بیٹی
کوئل

خط کو بند کرتے وقت اس کے دل میں اک وسوسہ سا پیدا ہوا۔
اگر فری آگئی تو۔؟ تو۔؟

ایسا کوئی خیال کبھی اس کے دل میں نہیں آیا تھا۔ یہ آج نجانے کیوں
اس کا دماغ بہکا تھا۔

تو۔ فری اور عدیل کو ایک بار پھر اکٹھا ہونے کا موقع مل جائے گا۔
اور اگر فری کی مایوس دعائیں اب بھی قبول ہو گئیں تو۔؟ اگر اس
کی ناکام محبت نے اپنا اثر دکھا دیا تو۔؟
تو کیا ہوگا۔؟

کیسے عجیب اور انہونے سے خیالات اس کے ذہن میں آرہے تھے۔
یہ ایسا کیوں تھا۔؟

اس نے اپنا سر جھٹک کر ان بہکے خیالات کو دماغ سے نکالنے کی کوشش
کی۔ مگر۔

ہوتا جیسے وہ تنہا تھی۔ اور اکیلے میں تو بالکل ہی پاگل سی ہو جاتی۔
 کئی ڈاکٹروں سے مشورہ کیا۔ لیکن سب کا ایک ہی جواب تھا کہ عورت
 جب اس دور سے گزرتی ہے تو اس کے مزاج میں کوئی نہ کوئی تبدیلی ضرور
 رونما ہوتی ہے۔

اور گھبرانے کی یا پریشان ہونے کی بات نہ تھی۔ یہ اسی کا اثر تھا۔ بچہ ہو
 جانے کے بعد اس نے خود بخود ٹھیک ہو جانا تھا۔

عدیل کی اُمی اور آبا جی کرنے گئے ہوئے تھے۔ ورنہ وہ ایک لفظ بھی
 اپنی ساس کو اپنی طبیعت کے بارے میں لکھتی تو انہوں نے فوراً اس کے
 پاس آ جانا تھا۔ کہ انہیں کوئل سے بڑا پیار تھا۔

اور اب۔ وہ موجود نہیں تھیں۔ تب اس نے اپنی اُمی کو خط لکھ دیا
 تھا۔ بڑی بے چینی سے ان کا انتظار کر رہی تھی۔ مگر ہنوز ادھر سے کوئی اطلاع
 کوئی جواب نہیں آیا تھا۔

آج کل تو اسے کینز بھی بہت یاد آرہی تھی۔ مگر اسے اُمی آبا کے آرام
 کی وجہ سے اس نے بلانا درست نہ سمجھا۔ اس گھر کو وہ بڑی اچھی طرح سنبھالتی
 تھی۔

اُمی آبا کا اس کے بغیر گزارہ بڑا مشکل تھا۔ کوئل اپنی ذات سے کسی کو
 تکلیف پہنچانا اچھا نہ سمجھتی تھی۔ اور اُمی آبا تو اس کے والدین تھے۔

ان کی خدمت کرنا تو خود اس کا اپنا فرض تھا نہ کہ انہیں آرام دینے والے
 ان کی خدمت کرنے والوں کو ان سے علیحدہ کر کے انہیں پریشان کرتی۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ نہ اُمی آبا میں سے کوئی آیا اور نہ ہی خط کا جواب۔
 جانے کیا وجہ تھی۔؟ ناراضگی بھی کوئی نہیں تھی۔ پھر نجانے کیوں کوئی خط
 کا جواب ہی نہیں دے رہا تھا۔ خیریت تو تھی وہاں۔؟
 وہ انہیں سب کے خیالوں میں کھوئی بیٹھی تھی۔ بڑے فکر و تردد سے سرچ
 رہی تھی۔

یوں بھی نجانے آج کل جی کو کیا ہو گیا تھا۔ ایک منٹ اکیلی رہتی تو گھبرا
 سی محسوس ہونے لگتی۔

ورنہ وہی وہ تھی کہ عدیل دفتر بھی چلا جاتا تو بھی اسے تنہائی نہ محسوس ہوتی
 اس کے خیالات میں کھو جاتی تو یوں لگتا جیسے وہ اس کے پاس ہی تھا۔
 اور اب کچھ ایسا ہو گیا تھا کہ پاس بھی ہوتا تو جی گھبراتا رہتا۔ یوں محسوس

”امی کستی تھیں کہ میں اب بوڑھی ہو گئی۔ پہاڑوں پر کہاں چڑھ سکوں گی۔
تمہارے سیر سپاٹے کے دن ہیں تم جاؤ۔“
”اور آبا۔؟“

”ان کو کام سے فرصت ہی کہاں ملتی ہے۔ میں سوچتی ہوں باجی! وہ
بھلا اتنی محنت کیوں کرتے ہیں۔؟ انہوں نے کون سی بچوں کی فوج پالنا
ہے اب۔“

”پنگلی! ابھی انہوں نے تجھے بیاہنا ہے۔“
”کول نے بڑے پیار سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
”اور اس کے لیے وہ نہیں کمائیں گے تو کیا آسمان سے گرے گا۔؟
اچھا یہ تو بتا تیرے لیے کہاں کہاں سے رشتے آتے ہیں۔ اور اتمی کا ارادہ کیا
ہے۔؟“

”چھوڑو باجی! اب تم بھی بڑی بوڑھیوں کی طرح رشتوں کی باتیں کرنے
لگیں۔“

”بڑی بوڑھیوں کی طرح کیا ہوا۔ میں تمہاری بہن ہوں اور بہن سے
زیادہ کسے دلچسپی اور ارمان ہو سکتا ہے۔“
”کول نے اصرار کیا۔“

”بتاؤ نا۔؟“

”آئے تھے ایک دو۔ فریج نے سرسری انداز میں کہا۔
”پھر۔؟ کون کون تھے وہ۔؟“

اگر ان میں سے بھی کوئی نہ آیا تو۔؟ پھر وہ کیا کرے گی۔؟
اس خیال سے ہی اس کا جی گھبرا اٹھا۔ جلدی سے اٹھ کر کمرے کی کھڑکیاں
کھولنے لگی۔

”تسلیم باجی۔!“
”کول گھبرا کر پیچھے پڑی۔
فریج کمرے کے وسط میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔“

”ارے فریج تو۔!“
وہ بھاگ کر کول کے قریب آگئی۔ اور چہرہ دونوں بہنیں بڑے خلوص
اور پیار سے ایک دوسرے سے بغلیں ہو گئیں۔
بہت سارے گلے شکووں کے بعد جب دونوں آمنے سامنے بیٹھیں
تو فریج اسے سر سے پاؤں تک بڑے غور سے دیکھنے لگی۔
”ارے باجی! آپ تو بہت کمزور ہو گئی ہیں۔“
پھر شوخی سے مسکرائی۔

”لیکن پہلے سے بہت زیادہ حسین۔ یہ آپ کے دولہانے کیا کر دیا ہے
آپ کو۔؟“

”ہٹو بھی۔ آتے ہی شرارتیں شروع کر دیں۔“
”کول شرما سی گئی۔“

”تم مجھے یہ بتاؤ کہ اتمی اور آبا کیوں نہیں آئے۔؟ میں نے خط میں اتنی تاکید
کی تھی۔“

”جانے کون کون تھے اور کیا کیا تھے۔ میں نے تو صاف انکار کر دیا۔“
 فریحہ نے لا پرواہی سے بتایا۔
 ”وہ کیوں؟“ کوئل چونکی۔
 ”میں نے سوچا جب میری باجی نے اتنے رشتے ٹھکرا دیئے تو میں کیا
 ایک دو کو بھی انکار نہ کروں؟“
 ساتھ ہی وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔
 ”سچ پوچھو باجی! تو ابھی بیاہ کرنے کا موڈ ہی نہیں بننا۔“
 ”پگلی! شادی بیاہ کوئی کھیل مذاق تو نہیں کہ موڈ بننے کا انتظار کیا جائے“
 کوئل نے اسے سمجھایا۔
 ”شادی کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔ اس عمر میں مناسب رشتہ نہ ہو تو پھر
 اچھا رشتہ ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔“
 ”اب آپ کا بھی تو ہوا ہی ہے۔“
 شاید وہ نادانستگی میں کہہ گئی تھی۔ کوئل نے سٹپٹا کر اسے دیکھا تو اس نے
 جلدی سے بات بدل دی۔
 ”وہ باجی! میں آج کل مصوری سیکھ رہی ہوں۔ ماڈرن آرٹ۔“
 جس طرح اس نے بات بدل لی تھی اسی طرح کوئل نے بھی مناسب
 یہی سمجھا کہ اپنا موڈ درست رکھے۔ یوں بھی وہ ہمیشہ سے بڑے ٹھنڈے
 مزاج کی مالک رہی تھی۔
 ”ارے وہی ماڈرن آرٹ۔ جس میں دو کونہیں اور تین دائرے بنا دو

تو اس کا نام اُداس شام ہو جاتا ہے اور اگر دائیں کونے دو ترچھی لکیریں
 کھینچ دو تو وہ ماں اور بچہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔“
 کوئل نے جدید آرٹ کا مذاق اڑایا۔
 ”باجی! آپ بھی بد ذوق لوگوں کی طرح آرٹ کا مذاق اڑا رہی ہیں۔
 اسے سمجھنے کے لیے تو دیدہ بننا چاہیے باجی۔ دیدہ بننا۔ اچھا کل سے میں آپ
 کو اس کے سیمینز سمجھانا شروع کروں گی۔“
 ”نا بابا! مجھے بخشو۔ میں بد ذوق ہی بھلی۔“
 کوئل نے مسکرا کر کانوں کو ہاتھ لگایا۔
 ”اور باجی! مزے کی بات تو ابھی میں نے بتائی ہی نہیں۔“
 ”کیا؟“
 کوئل کے پوچھنے پر وہ بچوں کی طرح جوشیلی آواز میں بولی۔
 ”میں چند ماہ تک فرانس جا رہی ہوں۔“
 ”کیا کہا؟ فرانس؟ یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو فری؟“
 وہ حیران سی ہو گئی۔
 ”ہاں باجی! فرانس۔ اس میں حیرانگی کی کیا بات ہے۔ فکر نہ کرو اسی
 کرۂ ارض پر واقع ہے۔“
 ”مگر کیا کرنے؟“
 کوئل کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ان کے خاندان میں اتنی آزادی تو
 نہ تھی۔!

سنو باجی! مصوروں کے لیے پیرس وہی حیثیت رکھتا ہے جو مسلمانوں کے لیے خانہ کعبہ۔ جس نے فن کی گہرائیوں تک جانا ہو۔ اس کی روح کو سمجھنا ہو۔ اسے پیرس جانا چاہیے۔ میں فی الحال دو سال کے لیے جا رہی ہوں امید ہے دو سال میں کافی کچھ سیکھ جاؤں گی۔ کیوں باجی؟

”یہ تو تم نے عجیب سی بات سنائی ہے۔ یہ بتاؤ کیا تم اکیلی جا رہی ہو؟“

کول کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔

”اکیلی۔؟ باجی! میں کوئی بچی تو نہیں جو راستے میں کھو جاؤں گی۔“

فریجہ تنک کر بولی۔

”نہیں فری! کچھ بھی ہو۔ غیر ملک ہے۔ وہ مغرب ہے۔ تم مشرقی لڑکی ہو۔ دونوں میں بہت فرق ہے۔ ذہنیاتوں کا۔ رسم و رواج کا۔ اگر تم میری رائے پوچھو تو میں یہی کہوں گی کہ مجھے تمہاری یہ خواہش پسند نہیں۔“

”ارے چھوڑیے بھی باجی! آپ تو بہت ہی دقیانوس ہوتی جا رہی ہیں مجھے تو بڑی امید تھی کہ آپ میری حمایت کریں گی۔ مگر آپ نے تو مجھے بالوس ہی کر دیا۔“

”اچھا خیر فی الحال چھوڑو اس بحث کو۔“

کول نے سوچا پھر کسی وقت اسے سمجھائے گی کہ اس کی یہ عمر اب دُور از ملک میں جانے والی نہ تھی۔ اب اسے شادی کر کے گھر بسانا چاہیے تھا۔

”جاؤ جا کر منہ ہاتھ دھو لو۔ میں ذرا باورچی خانے میں جا رہی ہوں۔“

کول اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں بھی کیسی پاگل ہوں۔ آتے ہی باتیں لے بیٹھی اور تمہیں چائے پائے کا پوچھا ہی نہیں۔“

فریجہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”وہ دیکھو وہ تمہارا کمرہ ہے۔ ضرورت کی ہر چیز تمہیں اس میں مل جائے گی۔ خیر و کو کہہ کر میں تمہارا پیچی بھی رکھوا دیتی ہوں۔“

کول اس کے ساتھ ساتھ اس کے کمرے تک چلی آئی۔

فریجہ نے اس کمرے میں اک نگاہ دوڑانے کے بعد ساتھ والے دوسرے کی طرف دیکھا۔ کول مسکرائی پھر قدرے شرماتے ہوئے بولی۔

”یہ ہماری خواب گاہ ہے۔“

”دیکھ سکتی ہوں۔؟“

”ضرور۔“

دونوں اندر چلی گئیں۔

”باجی! ماشاء اللہ آپ کا گھر تو بڑا پیارا ہے۔“

سٹائن بھری نگاہوں سے وہ ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھی۔

”آپ کا ڈرائینگ روم بھی بڑا خوبصورت ہے۔ بہت سلیقے سے سجا ہوا۔“

آپ کا گھر دیکھنے کا مجھے بڑا اشتیاق تھا۔“

”بھی ایک سال تک مجھے کسی نے پوچھا تک نہیں۔“

کول نے گلہ کیا۔

”کوئی بھی میرے پاس نہیں آیا۔“

”اوہ۔! فریج چپ سی ہو گئی۔“
 ”ارے! تم نے مجھے پھر باتوں میں لگالیا۔ اب تو عدیل کے آنے کا بھی وقت ہو چلا۔ میں جا کر پتہ تو کروں خیر کیا کر رہا ہے۔“
 جتنی دیر وہ باورچی خانے میں رہی فریج غسل کر کے تروتازہ ہو گئی۔
 چائے کی ٹرالی خود ہی لیے کومل ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو فریج بھی گھوم پھر کر، اس کا سارا گھر دیکھنے کے بعد وہیں آگئی تھی۔
 ”سچی باجی! وہ اب کومل کو سر سے پاؤں تک دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہ میں سائنس کے علاوہ رشک بھی تھا۔“
 ”اتنا سلیقے سے اور اتنا اچھا، اتنا پیارا سجا ہوا آپ کا گھر ہے ناکہ بار بار اور بے اختیار منہ سے تعریف نکلی جا رہی ہے۔ بالکل ایک چھوٹی سی جنت۔! پھر وہ مسکرائی۔ بڑی خلوص بھری مسکراہٹ تھی۔“
 ”اور اس جنت میں چلتی پھرتی آپ بالکل ایک عورت ہی لگتی ہیں۔“
 کسی خوشامد یا چالوسی کے بغیر وہ بڑے خلوص سے کہہ رہی تھی۔ کومل شرم سے گئی۔
 چائے کے دوران دونوں بہنیں خوب باتیں کرتی رہیں۔ ادھر ادھر کی رشتہ داروں کی۔ دوستوں عزیزوں کی۔ بے شمار ہی باتیں کر ڈالیں۔
 ”ارے! عدیل ابھی تک نہیں آیا۔“
 یکدم کومل کلانی کی گھڑی دیکھتے ہوئے قدرے تردد سے بولی۔
 ”ورنہ وہ تو اس وقت تک آچکا ہوتا ہے۔“

”اور آپ کب شادی کے بعد پھر لاہور آئیں۔ وہ تو آپ کا میکہ ہے۔“
 ”وہ۔ دراصل۔ کومل پھر شرمائی۔ ہوئے سے بولی۔“
 ”عدیل کہیں جانے ہی نہیں دیتا۔“
 ”تقریباً سارا پاکستان تو آپ نے گھوم پھر ڈالا۔“
 ”دونوں ہی تھکے نا۔ اکیلی کو نہیں جانے دیتا۔“
 ”تو دونوں ہی لاہور بھی آ جاتے۔“
 ”پاگل ہو تم۔ ابھی تمہیں سمجھ نہیں نا۔“
 کومل نے بڑے دلار سے اسے دیکھا۔
 ”جب تمہاری شادی ہوگی تب سمجھ جاؤ گی سب کچھ۔ وہ سیر تو ہنی مون کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ پھر اس کے بعد چھٹی ہی نہیں ملی۔“
 ”اور اب مری کیسے جا رہے ہیں۔؟“
 فریج تو سوچے سمجھے بغیر بال کی کھال اتار رہی تھی۔
 ”چھٹی لے کر۔“
 ”لاہور بھی آ سکتے تھے۔“
 ”گرمی بہت ہے۔“
 ”تو آپ کی ساری زندگی اسی گرمی میں گزری تھی نا۔ اب کیا زیادہ ہو گئی ہے۔؟“
 ”اب۔؟ اب اور بات ہے فری۔! عدیل کی خواہش ہے کہ مجھے زیادہ سے زیادہ آرام ملے۔“

”اُداس ہو گئی ہیں۔؟“

فریحہ شرارت سے مسکرائی۔

”نہیں نہیں۔“ کومل جھینپ اٹھی۔

”وہ تو میں تمہارے لیے کہہ رہی تھی۔ کہ اگر دیکھے کون آیا ہے۔ اسے بھی

بہت انتظار تھا۔ اکثر تم سب کو یاد کرتا رہتا ہے۔“

کومل نے بات بنائی۔ ورنہ وہ جانتی تھی کہ خود اس کو پا کر اس میں کھو کر

عدیل اور سب سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ کسی کو یاد کرنا تو کجا اس نے تو کسی کے

متعلق کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

اپنی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے کومل نے جب امتی اور فریحہ وغیرہ کو اپنے

پاس بلا لینے کا مشورہ عدیل سے کیا تو اس نے کچھ ناک بھوں ہی چڑھائی تھی۔

کریوں ان کی آزادی میں خلل پڑنا تھا۔ اپنے اور کومل کے علاوہ اسے

گھر میں کسی اور کا ہمہ وقت موجود رہنا قطعی ناپسند تھا۔ مگر کومل کی خوشی اور

طبیعت کو دیکھتے ہوئے اس نے اس کی مرضی پر سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔

کھانے کی میز پر دونوں ہی تھیں۔ فریحہ دیکھ رہی تھی۔ کومل کی بے قرار

نگاہیں بار بار دروازے کی سمت اٹھ رہی تھیں۔

اس کی ہر اٹھتی نگاہ پر فریحہ بڑے معنی خیز انداز میں مسکرا پڑتی۔ کومل جھینپ

جاتی۔

”فریحہ! تم بہت شریہ ہو گئی ہوئی ہو۔ اسی سال امتی سے کہہ کر تمہیں بھی

میں نے باندھ دینا ہے۔“

”پھر۔؟“ فریحہ مسکرائی۔

”تم مجھ پر ہنستی ہوتا۔ پھر میں تمہیں مذاق کیا کروں گی؟“

پھر کومل یکدم سنجیدہ ہو گئی۔

”نگلی! میاں بیوی کے دل میں ایک دوسرے کی ایسی ہی چاہت اور

خلوص ہو تو ازدواجی زندگی اچھی گزرتی ہے۔ ورنہ دونوں ہی ایک دوسرے

سے لاپرواہی برتنے لگیں تو گزارہ مشکل۔“

اور ابھی وہ بات ہی کر رہی تھی کہ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کومل مسکرا

پڑی۔ بڑی دلاؤیز اور پیاری سی مسکراہٹ تھی۔

فریحہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ، آنکھوں کی عجیب سی،

خوبصورت سی چمک اور چہرے کی گلنار ہوتی رنگت سے ہی اسے معلوم ہو گیا

کہ یہ چاپ یقیناً عدیل کے قدموں کی تھی۔

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ حیران سی رہ گئی۔ وہ کتنا بدل گیا تھا۔ اس نے

بڑی خوبصورت سی مونچھیں رکھ لی تھیں۔ جن کی وجہ سے وہ نہ صرف مردانہ

وجاہت اور بانگین کا مکمل نمونہ لگ رہا تھا بلکہ وہ بڑا باوقار اور پرکشش

شخصیت والا مرد دکھائی دے رہا تھا۔

فریحہ کی نگاہیں جھبک گئیں۔

”ارے رے آج تو ہمارے گھر بڑی بڑی ہستیاں آئی ہوئی ہیں۔“

وہ فریحہ کو دیکھ کر دُور سے ہی پکار اٹھا۔

”ہستیاں نہیں۔ صرف ایک ہستی۔“

کول چکی۔

”اکیلی ہی آئی ہو۔؟“

اس نے پھر لوچھا۔

کول نے محسوس کیا کہ یکدم فری کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ پہلے تو وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش سی رہ گئی۔ کوئی بات نہ کر سکی۔ مگر پھر اس نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا اور مسکراتی ہوئی اٹھی۔

”تسلیم۔!“

”جیتی رہو۔“

عدیل نے اپنے رشتے کے لحاظ سے اور کچھ شرارت سے قریب آکر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر کول کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کھانا کھانے کے لیے پلیٹ اپنی طرف سرکائی۔ سالن ڈالنے ہی لگا تھا کہ یکدم کچھ یاد آ گیا۔ شاید یہ کہ اس نے فریج سے کوئی اور بات نہیں کی تھی۔ آخر وہ اس کی سالی تھی۔ اور ان کے گھر مہمان آئی تھی۔

”بھئی شکر ہے تم لوگوں کے ذہنوں میں ہماری تھوڑی بہت یاد محفوظ ہے۔“ اس نے بات کرنے کے لیے شکوہ کیا۔

فری بڑے غور سے عدیل کو دیکھ رہی تھی۔ کول کی نگاہ اسی پر تھی۔

”کاش! میں ان یادوں کو بالکل مٹا سکتی۔“ جانے فری کی آنکھوں میں

کول نے کیا دیکھ لیا تھا۔ اس کے دل میں یہی خواہش پیدا ہوئی۔

”آج پورے ایک سال بعد تمہیں دیکھا ہے۔ سناؤ کیا کر رہی ہو آجکل۔؟“

”بس وقت گزار رہی ہوں۔“

عدیل کی بات کا فریج نے انتہائی کمزوری آواز میں جواب دیا۔

”افوہ! بڑی سنجیدہ ہو گئی ہو۔“ عدیل مسکرایا۔

”کون فری اور سنجیدگی۔؟“ کول بولی۔

”کیسی باتیں کرتے ہو تم بھی۔“

پھر وہ ہنس ہنس کر فریج کے من میں حو نیا سودا جدید آرٹ سیکھنے کا سما یا تھا اس کے متعلق بتانے لگی۔

عدیل بھی اسے مذاق کرتا رہا۔ بڑی سادگی سے۔ بڑی صاف دلی اور خلوص کے ساتھ۔ تینوں ہنستے رہے۔ کھانا کھاتے رہے۔

”ہاں بھئی کول۔!“ عدیل کو جیسے کچھ یاد آیا۔

”میرا خیال ہے اب کل مری کو کوچ کر جائیں۔ رولش کا انتظام تو ہو ہی چکا ہے۔ آج سامان وغیرہ باندھ لینا۔ فری بھی ہاتھ بٹانے کو آگئی ہے۔“ مگر تمہاری چھٹی۔؟“

”کل اتوار ہے تم دونوں کو پہنچا دوں گا اور پھر اگلے ہفتے انشاء اللہ میں بھی تمہارے پاس۔“

”میرا خیال ہے اکٹھے ہی نہ چلیں۔؟“

”نہیں نہیں۔ یہاں موسم بہت گرم ہو رہا ہے۔“

”تو کیا۔؟“

”میں نہیں چاہتا کہ تم اس۔۔۔“

کومل نے عدیل کو ٹھٹھو کا دے کر فریجہ کی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے خاموش کرادیا۔

جانے کیا منہ سے نکال دے۔ اسے زبان پر تو قابو تھا ہی نہیں جو جذبات کہتے، جودل میں آتا، جو من میں سماتا، کہہ دیا کرتا تھا۔ فری نے شاید کچھ محسوس کیا تھا۔ جلدی سے ہاتھ دھونے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

عدیل نے بڑا برا سامنہ بنایا۔
”اب تم ہر وقت مجھ پر کرفیو لگایا کرو گی نا۔ میں آج ہی اسے ناراض کر کے یہاں سے بھگاتا ہوں۔“

وہ فریجہ کے متعلق کہہ رہا تھا۔
”ہائیں ہائیں! کیسی باتیں کر رہے ہو۔؟“
کومل اس کے پاس ہی کھڑی میز پر سے برتن اکٹھے کر رہی تھی۔
”تو اور کیا اب یہ ہر وقت ہمارے سر پر مستطراہ کرے گی اور مجھ سے یہ پابندی برداشت نہیں ہو سکتی۔“
اس نے بے خیالی میں کومل کی کمر میں بازو ڈال کر اپنی طرف کھینچا۔

”اونہوں۔!“
کومل تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی۔ گھبرا کر ادھر دیکھا۔ فریجہ ابھی ہاتھ دھو کر نہیں آئی تھی۔ اطمینان کا سانس لیتے ہوئے ہوئے سے بولی۔
”وہ آرہی ہوگی۔“

”دیکھنا۔ میں نہ کہتا تھا۔“
”مگر عدیل! کومل نے اس کی بات کاٹ کر گویا اسے سمجھانے کی کوشش کی۔
”ہم نے خود ہی اسے بلایا ہے۔“
”تو کیوں بلایا ہے۔؟“ وہ جھنجھلا پڑا۔
”اس کے بغیر کیا ہمارا کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا۔؟“
”ہائیں ہائیں۔!“ کومل نے حیرت سے اسے گھورا۔
”تم نہیں جانتے کیوں بلایا ہے۔؟“
”اوہ۔!“

اسے جیسے کچھ یاد آگیا۔ یکدم اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی۔ بڑے پیار سے، بڑے لاڈ سے، اس نے کومل کا ہاتھ تھام کر دبا دیا۔
”خدا کرے یہ وقت خیریت سے اور جلد از جلد گزر جائے۔“
پھر اس کی آنکھوں میں شوخی ناچی۔
”منا یا ممتی۔؟ میری محبت کے بدلے میں کیا تحفہ دے رہی ہو مجھے۔!“
کومل شرمائی۔ سرخ ہوتے ہوئے کوئی جواب دینے ہی لگی تھی کہ فریجہ کمرے میں آگئی۔ عدیل سے ہاتھ چھڑا کر وہ جلد جلد پھر برتن سمیٹنے لگی۔
حسین سپنا دیکھتے دیکھتے اچانک کوئی جھنجھوڑ کر جگا دے۔ تو جیسے جگانے والے پر غصہ آجاتا ہے۔ اسی طرح اس وقت اسے فری کی آمد بڑی بُری لگی۔
ناگواری سے کچھ بڑبڑاتے ہوئے اور انتہائی غصیلی نگاہوں سے فری کو دیکھتے ہوئے عدیل کمرے سے باہر نکل گیا۔

یہ بڑا ہسٹ، یہ ناراضگی، یہ تکیہ نگاہ۔ عدیل کی شدید محبت کی غماز تھی۔
اس کی وارفتگی، اس کی بے قراری کی ضامن تھی۔!!
کول کی مسکراہٹ کچھ اور بھی گہری ہو گئی۔ خود اعتمادی کچھ اور بھی بڑھ
گئی۔ اور جینے کی تمنا دوچند ہو گئی۔

مری میں دو چار دن تو گھر کو ٹھیک کرنے میں گزر گئے۔ اس کے بعد
اگلے اتوار عدیل کے آنے پر دعوتوں کا وہ تانا بندا کہ ختم ہونے میں ہی نہ
آتا تھا۔

عدیل کے بہت سارے دوست اور ملنے جلنے والے مری آئے ہوئے
تھے۔ ان سب نے ہی باری باری ان کی دعوت کڑوا لی۔
فریجہ ان دعوتوں میں بڑے شوق سے اور خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی رہی۔
کول کو اب اندازہ ہوا کہ وہ پہلے سے بھی بہت زیادہ ماڈرن اور تیز طرار ہو
چکی تھی۔

لباس کی تراش خراش اور پہننے کے ڈھنگ میں تو اسے کمال حاصل
تھا۔ موقع کی مناسبت سے بہترین سے بہترین لباس پہنتی اور خود کو اتنے

خوبصورت انداز میں سنوارتی کہ ہر محفل میں وہی وہ ہوتی! بعض اوقات اس کی بے تکلفی، اس کی حرکات کو مل کو بڑی اوجھی سی لگتیں۔

اس نے دل میں ایک دو بار سوچا بھی کہ فریحہ کو سمجھائے کہ وہ اب پہنچی نہ تھی۔ اسے اپنے میں مناسبت پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔ مگر پھر یہ سوچ کر چپکی ہو رہی کہ نجانے وہ اس کی نصیحت کا کیا مطلب لے۔ وہ اس کے گھر آئی ہوئی تھی اور چند دن کی مہمان تھی۔ کہیں برا مانا کر واپس ہی نہ چلی جائے۔

کہ۔ اس واقعہ کے بعد اب کوئل اس کے منہ نہیں لگنا چاہتی تھی۔ اور اپنی عزت اپنے ہاتھ کے مصداق یہ وقت حسن و خوش اسلوبی سے گزار لینا چاہتی تھی۔

خود اس کی طبیعت آج کل بڑی خراب رہنے لگی تھی۔ حالانکہ وقت بھی قریب نہیں تھا۔ ابھی تین ماہ باقی تھے مگر پھر بھی۔

شاید ذہنی طور پر وہ پرسکون نہ تھی۔ بڑی الجھی الجھی سی تھی۔ اسی لیے اسے کسی کام میں یا کہیں آنے جانے میں دلچسپی محسوس نہ ہوتی تھی۔ اور ابھی طبیعت زیادہ خراب اور گری گری سی رہتی تھی۔

وہ رات بڑی ٹھنڈی تھی۔ خلاف توقع آج سارا دن بارش ہوتی رہی تھی۔ اس لیے سردی معمول سے بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔

کوئل کی طبیعت کچھ زیادہ خراب تھی۔ سر شام ہی وہ اپنی خواب گاہ

میں اُلٹی۔

لمحہ بھر کے لیے بھی اس کے بغیر عدیل کا نہیں جی نہ لگتا تھا۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ فریحہ ان کی مہمان تھی اور منیر بانی کے فرائض کا بھی کچھ تقاضا تھا۔ کوئل کی طبیعت اگر خراب تھی تو اس کا بھی تو گھر تھا۔ اس کے بھی کچھ فرائض تھے۔ وہی کچھ دیر کے لیے فریحہ کو کمپنی دے دیتا۔

یہ کچھ بھی نہ سوچا اور وہ کوئل کے پیچھے پیچھے ہی چلا آیا۔ تکلیف کے باوجود کوئل نے اسے اس کا احساس دلانے کی کوشش کی مگر وہ مانا ہی نہیں۔ ایک لفظ بھی سننے کو وہ تیار نہ تھا۔ کسی ضدی بچے کی طرح نافرمانی کرتے ہوئے اس کے پاس ہی بیٹھا رہا۔

”اب تمہاری طبیعت ٹھیک نہ ہو تو میں کس طرح تمہیں اکیلا چھوڑ کر اس کے پاس جا بیٹھوں۔ اور پھر وہ کوئی کچی بھی نہیں جو اکیلے میں ڈر جائیگی۔“

”لیکن عدیل۔۔۔“

”بس کہہ دینا۔ تمہیں اکیلے چھوڑ کر میں نہیں جاؤں گا۔“

”اور میں تو جیسے اس سے بھی چھوٹی بچی ہوں جو تم مجھے اکیلا نہیں چھوڑ رہے۔“

اس کی بچوں ایسی ڈھٹائی پر اسے پیار بھی آگیا۔ عدیل کا ہاتھ تھام کر کوئل مسکرا دی۔

”میں کب کہتا ہوں کہ چھوٹی بچی ہو۔ البتہ میری ذمہ داری تو ہونا۔ اور تمہیں اس وقت تکلیف ہے۔“

عدیل بھی مسکرانے لگا۔

”لاؤ تمہارا سر وغیرہ دبا دوں۔“

”تمہیں باتیں بنانا خوب آتی ہیں۔“

”تمہاری ہی محبت نے سکھا دی ہیں۔“

اور عدیل نے اسے آغوش میں بھر لیا۔

”تمہارے پاس ہی تمہارے قریب ہی رہنے کے لیے تو سب جیلے ہانے

تراش رہا ہوں۔ خود ہی سمجھ جاؤ نا۔“

ایسا سکون، ایسا اطمینان، اس کی محبت بھری آغوش میں تھا اور اس

کی وارفتہ اداؤں میں کہ برائے چندے وہ اپنی تکلیف بھی بھول گئی۔

عدیل کی آغوش میں چہرہ چھپا کر اس نے آنکھیں موند لیں۔ وہ اس کے

بالوں کو سہلانے لگا۔ اس کے کان کے ساتھ ہونٹ لگا کر پیار و محبت بھری

باتیں ہوئے ہوئے مدھم مدھم آواز میں کرنے لگا۔

کروڑ بار دہرایا ہوا خلوص و وفا کا عہد ایک بار پھر دہرانے لگا۔ اور

یہی پرانی مگر ہر بار نئی آنکھی اور بے حد اچھی لگنے والی باتیں سنتے سنتے وہ

ایسی مدہوش ہوئی۔ اس پر ایسا سحر طاری ہوا کہ نیند کو اسے اپنی گرفت میں

لینے میں ذرا دقت محسوس نہ ہوئی۔

خواب کے عالم میں بھی اس کے خوبصورت اودھ کھلے ہونٹوں پر اک

ملکوتی تبسم رقصاں تھا۔ اس کے حسین اور پاکیزہ چہرے پر مامتا کا ایسا تقدس

تھا کہ حوریں بھی اس سے محروم رہی ہوں گی۔

عدیل اسے ایک لمبے دیکھے جا رہا تھا۔ نیند میں وہ کراہی۔ عدیل کی محبت
ٹوٹ گئی۔

جانے اسے کتنی تکلیف تھی جو وہ نیند میں بھی کراہ رہی تھی۔ سارا درد گویا

عدیل کے سینے میں اتر آیا۔

پریشان ہوتے ہوئے اس نے اسے اپنے ساتھ لگالیا۔ اس کی خاطر وہ

کس تکلیف و کرب کے عالم سے گزر رہی تھی۔

ممنون نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے عدیل نے اس کے چہرے پر

کتنی پیار کر ڈالے۔

”او نہوں۔“ وہ نیند میں بڑبڑاتی۔

عدیل نے مسکرا کر بڑی وارفتگی سے ایک دو پیار اور کرتے ہوئے اس

کا سر تکیے پر ڈال دیا۔

ذرا بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن خیر و کے بلانے پر اسے فریج

کا ساتھ دینے کے لیے کھانے والے کمرے میں جانا ہی پڑا۔

مگر وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ خیر و سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ فریج

نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا تھا اور وہ آرام کرنے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی

شام اکیلے گزارنے کی وجہ سے شاید اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ عدیل

کو خیال آیا۔

فریج کوئل کی بہن تھی۔ اس کی محبوب بیوی کی بہن۔ کوئل کی طبیعت

ٹھیک نہیں تھی۔ اسے ہی اس کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔

مجھے بھی کچھ نہیں سوچھا۔ امید ہے تم ناراض وغیرہ نہیں ہوگی۔ اور اگر ناستکی میں کوئی بے پرواہی ہو بھی گئی ہو تو معاف کر دو گی۔“
وہ دروازے میں ہی کھڑا کھڑا کہہ رہا تھا۔

”ارے نہیں۔ اور آپ۔ تم۔ وہیں کیوں کھڑے ہو۔ اندر آ جاؤ۔“
عدیل اور کول کی شادی کو ایک سال ہو گیا تھا۔ مگر ابھی تک فریجہ شاید یہ طے نہیں کر پائی تھی کہ عدیل سے اس کا طرزِ خطاب کیا ہونا چاہیے تھا۔ بڑی بہن کے شوہر کے ناطے اس نے اسے بھائی جان بھی کبھی نہیں کہا تھا اور کلاس فیلو یا دوست کا رشتہ بھی ٹوٹ چکا تھا۔
پھر لڑکی ہمیشہ وہ اسے کبھی آپ، کبھی تم اور کبھی کسی خطاب کے بغیر ہی بات کر لیا کرتی تھی۔ سبھی جانتے تھے کہ وہ کلاس فیلورہ چکے تھے۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ بہت بے تکلف بھی۔ اس لیے اس پر نہ کبھی کسی نے دھیان دیا۔ نہ کوئی اعتراض کیا۔
”آ جاؤ نا۔“

وہ نظریں جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ فریجہ نے پھر بلایا۔
”نہیں نہیں۔“ وہ چونکا۔

”کول کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ کہیں اسے میری ضرورت نہ ہو۔“
پھر جلدی سے مڑ کر وہ واپس چلا گیا۔ اس نے بھی کھانا نہیں کھایا۔ وہ تو صرف فریجہ کی خاطر آ گیا تھا۔ ورنہ کول کی طبیعت خراب تھی۔ اسے اندر ہی اندر بڑی بے چینی سی تھی۔

فریجہ کی طرف سے بے پرواہی برت کر وہ کول کی حق تلفی کر رہا تھا۔ شادی کے بعد میاں بیوی پر فرض عائد ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے شتر داروں سے رِق کا خیال رکھیں۔ اور وہ تو اپنا فرض بالکل نہیں نباہ رہا تھا۔ وہ بڑی بے پرواہی برت رہا تھا۔

ہاتھ دھو کر میز پر بیٹھ چکا تھا۔ اس خیال کے ساتھ ہی جلدی سے اٹھا اور فریجہ کو بلانے خود چل دیا۔

حالانکہ وہ کئی بار کھنکار کھنکار کر کمرے میں داخل ہوا تھا۔ مگر کبھی فریجہ نے اپنے شبِ خوابی کے خوبصورت اور مہین لباس پر گاؤں پہننے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ نجانے کیوں۔؟

عدیل کی نگاہیں جھکی جا رہی تھیں۔ دروازے میں ہی کھڑے کھڑے اس نے فریجہ کو کھانے کے لیے کہا۔
”مجھے آج بھوک نہیں۔“

وہ عدیل کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔
”کیوں بھوک نہیں۔ کول کی طبیعت ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے آج شام کو چائے کے ساتھ بھی کچھ نہیں تھا۔ پھر ایک سادہ پیالی سے کیسے تمہارا پیٹ بھر گیا۔؟“

اس نے پورے خلوص اور ایمانداری کے ساتھ اپنا فرض ادا کیا۔
”بس۔ پتہ نہیں کیوں۔؟“

”دیکھو فری! تمہاری باجی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پریشانی کی وجہ سے

بند بالکل نہیں آرہی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر میز پر سے سگریٹ اور لائٹ اٹھالیا۔
کول نے غیند میں ہی پھر کر وٹ پٹی۔ اب اس کا رخ عدیل کی طرف تھا۔
پیشانی اور چہرے کے ارد گرد بکھرانے والے سیاہ بالوں نے اسے حسین سے
حسین تر بنا دیا۔

سگریٹ کے کٹ لیتے ہوئے، کول کو بڑے غور سے تکتے ہوئے اچانک اس
کی سوچ فریج کی طرف چلی گئی۔

وہ کول کی نسبت کہیں زیادہ ماڈرن تھی۔ کہیں زیادہ چیخل اور تیز طرار۔
مگر جوش کول کے حسن و سنجیدگی میں تھی وہ فریج کے چیخل پن۔ فلیشن اور
شوخی میں نہ تھی۔

اور وہ۔ وہ خوش قسمت تھا کہ اس نے شادی کے لیے کول کا انتخاب
کیا تھا۔

عدیل سوچوں میں کچھ اس طرح ڈوبا ہوا تھا کہ اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ
کول جاگ پڑی۔

”عدیل۔! عدیل جاگ رہے ہو۔؟“

اس کی آواز میں عجیب سا کرب تھا۔

”ہوں۔“ اس نے مندی ہوئی آنکھیں جلدی سے کھولیں۔

”کیا ہوا جان۔؟“

وہ یکدم اس پر جھک گیا۔

”میرے پیٹ میں بہت درد ہے۔“

خیر و کوسب کچھ اٹھا لینے کی ہدایات دے کر واپس خواب میں چلا آیا۔
کمرے کی مدھم نیلگوں روشنی میں کول سوئی پڑی بڑی معصوم سی لگے ہی
تھی۔ تھوڑے تھوڑے ابھرے ہوئے اس کے پیٹ کے کچھ جھٹکے پر سے کبل
سر کا ہوا تھا۔

سردی بہت تھی۔ عدیل جلدی سے قریب آیا۔ بڑی احتیاط سے،
بڑے پیار سے اسے گردن تک اچھی طرح کبل اوڑھایا۔

ایک بار پھر نگاہ اس کے نکھرے نکھرے مگر زرد چہرے پر جا پڑی۔
جب سے بچہ ہونے کی امید ہوئی تھی وہ کچھ اور بھی حسین ہو گئی تھی یامتا
کا یہ انوکھا اور مقدس رُوپ عورت کی عظمت کا شاہد ہے اور مرد کی محبت
کا ضامن۔!!

عقیدت اور احترام سے عدیل کا سر اس کے حضور جھک گیا۔
”اے عورت تو عظیم ہے اور میں تیری عظمت کو سلام کرتا ہوں۔“
وہ بہت احتیاط سے اس کے قریب بیٹھ گیا۔

”اور میری کول۔! میری محبت! میری زندگی!! تو نے جن جذبوں سے
مجھے نوازا ہے میں ان کا احسان مند ہوں۔“

اس نے جھک کر اس کی صبح پیشانی کو چوم لیا۔
وہ کسمائی۔ تھوڑا سا کراہ کر اس نے کروٹ بدل لی۔
پیار و محبت میں ڈوبی وارفتہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اور کراتے
ہوئے عدیل بھی بستر پر دراز ہو گیا۔

اس نے اپنا بازو عدیل کی گردن میں ڈال دیا۔
”ہائے! میں مر گئی۔“ وہ ترپٹی۔

”بھٹہ رو کوئل! میں ابھی گرم پانی کی بوتل لاتا ہوں۔ آج سردی بہت ہے نا۔“

عدیل نے اس کے چہرے، پیشانی پر سے بھرے بال پر سے ہٹائے۔ پھر اسے اپنے دونوں بازوؤں میں بھر کر اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔

”کاش! تمہاری تکلیف میں لے سکتا۔“

”اوہ خدایا! درد کی لہر پھر اٹھی۔ وہ پیلی پڑ گئی۔“

”یاد آیا پیٹ درد کی دوا گھر میں ہے۔ ساتھ چائے بنا لاتا ہوں۔“

اس کی پیشانی ٹھنڈی ہوتی جا رہی تھی۔ عدیل نے اپنے گال اس کے ساتھ رگڑتے ہوئے اسے دلا سہ دیا۔

”بس ابھی ٹھیک ہو جاؤ گی میری جان۔! ابھی۔“

پھر اس نے آرام سے اسے بستر پر لٹا دیا۔

”نہیں عدیل! مجھے اکیلا چھوڑ کر نہ جاؤ۔“

عدیل اٹھ رہا تھا۔ کوئل نے کراہتے ہوئے اس کا بازو تھام کر اپنے سینے کے ساتھ بچھینچ لیا۔

”ایک منٹ جان! صرف ایک منٹ۔ ایک پیالی گرم گرم چائے۔ ایک درد کی گولی اور ایک گرم پانی کی بوتل۔ ایک منٹ میں یہ سب کچھ لے کر آتا ہوں۔“
”وہ خیر کیا سو گیا۔؟“

”ایک بج رہا ہے شاید۔ سو گیا ہو گا۔“

”تو پھر تم۔ یہ سب کیسے کرو گے۔؟“

”تمہاری خاطر سب کچھ کر سکتا ہوں۔“

اس نے کوئل کے گال تھپتھپائے۔

”بس ابھی واپس تمہارے پاس آیا۔“

عدیل نے جھک کر پھر اسے پیار کیا اور گاؤں پہنچتے ہوئے خواب گاہ سے باہر نکل گیا۔

کتنا اسے اس کا خیال تھا۔ کوئل نے انتہائی ممنون نگاہوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔

”اوہ۔!“

پھر درد کی لہر اٹھی۔ وہ بے چین ہو گئی۔ عجیب سی تکلیف تھی۔ جانے کیسی؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اتنی سردی کے باوجود وہ پسینہ پسینہ ہوتی جا رہی تھی۔

”یہ لویہ گرم پانی کی بوتل! یہ چائے۔۔۔ ارے ارے۔“

وہ جلدی سے اس کے قریب آیا۔ کوئل کا رنگ اتنا پیلا ہو رہا تھا کہ وہ

ساری جان سے لرز اٹھا۔

”کوئل! یہ لو۔ یہ گولی جلدی سے کھا لو۔“

”عدیل! جانے کیا ہو رہا ہے۔؟“

وہ جیسے ڈوبتی ڈوبتی بولی۔

”کسی لیڈی ڈاکٹر کو بلا سکتے ہو۔“

”اس وقت؟“ عدیل نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

”رات کے دو بج رہے ہیں۔ اس وقت کون آئے گی۔“

اس کی حالت دیکھ کر خود اسے پریشانی سے کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔

”اے یاد آیا۔ وہ مسز بخاری ہیں نا۔ جن کے اہل پرسوں کھانے پر مدعو تھے۔

وہ ڈاکٹر ہے۔ انہیں بلاؤں۔“

”کسی کو بھی لاؤ۔ مگر جلدی جاؤ۔“

وہ پھر تڑپنی۔

عدیل نے جلدی سے کپڑے تبدیل کیے اور سردی میں ٹھٹھرتا ہوا چل پڑا۔

ورد کی پھر لہرا مٹھی۔ کومل کو یوں محسوس ہوا گویا زہر میں بجھا اک خنجر اس کے

پیٹ میں اترتا ہی چلا جا رہا تھا۔

اب تکلیف برداشت سے باہر تھی۔ کوئی دو تین منٹ تک وہ اس

کرب میں مبتلا رہی۔ سارا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا۔

”فری۔ فری۔“

عدیل بھی جا چکا تھا۔ اس نے فریج کو جگانا چاہا۔ مگر اس کی آواز اتنی کمزور

تھی کہ ناکام رہی۔

ایک بار پھر وہی لہرا مٹھی۔ اسے پھر درد و کرب کے اسی جہنم سے گزرنا پڑا۔

تین منٹ تین صدیاں بن گئے۔

”عدیل! خدا کے لیے اب ابھی جاؤ۔ ورنہ تمہارے پیچھے پیچھے ہی میں۔۔۔“

اور اسی لمحے عدیل مسز بخاری کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوا۔

”کیا ہوا مسز عدیل۔؟“

مسز بخاری جلدی سے اس کی طرف بڑھا آئیں۔

”جی کچھ نہیں۔ کومل نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”افوہ۔! آپ کا چہرہ کتنا زرد ہو رہا ہے۔“

ڈاکٹر نے اس کی نبض ٹٹولی۔ پھر کومل پر سے کبل اتارتے ہوئے وہ عدیل

سے مخاطب ہوئی۔

”آپ ذرا باہر چلے جاتیے۔؟“

عدیل کمرے سے باہر نکل کر بڑی بے قراری سے ادھر ادھر ٹھٹھلنے لگا۔ وہی

طور پر اس کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ ساری تکلیف اسے ہی ہو رہی تھی۔

کومل سے کہیں زیادہ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔

وہ کومل کی صحت کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ کومل کی زندگی بچ جانے کی

خدا سے التجائیں کر رہا تھا۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر اس کے سارے حواس متحس ہوا مٹھے۔ مسز

بخاری باہر نکل آئی تھیں۔ وہ بھاگ کر ان کے قریب چلا گیا۔

”مسٹر عدیل! یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ آپ کی بیوی ماں بننے والی ہیں۔“

”جی ہاں۔“

”تو پھر میں آپ کو ایک منحوس خبر سنانے لگی ہوں۔“

”کیا۔؟“ وہ بُری طرح گھبرا گیا۔

”ان کا حمل ساقط ہو گیا ہے۔“
 عدیل نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔
 ”میں نے انہیں مار فیا لگا دیا ہے۔ آپ ایمبولینس منگوا کر انہیں ابھی
 ہسپتال بھجوا دیجیے۔“
 ”ڈاکٹر صاحبہ! کوئل تو بچ جائے گی۔؟“
 اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
 ”آپ بے فکر رہیے۔ انہیں کوئی خطرہ نہیں۔ البتہ آپریشن ہوگا۔ اور انہیں
 کچھ دن ہسپتال رہنا پڑے گا۔“
 اس نے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔
 ”اچھا اب میں چلتی ہوں۔“
 ”بہت بہت شکریہ۔ چلیے میں آپ کو چھوڑ آؤں۔“
 ”کوئی بات نہیں۔ مجھے قریب ہی جانا ہے۔ میں چلی جاؤں گی۔ آپ
 ایمبولینس کا جلد انتظام کیجیے۔ شب بخیر۔!“
 خود جلدی کر کے شاید وہ عدیل کو عجبت کا احساس دلانا چاہتی تھی۔
 ”شب بخیر۔!“ کھوتے کھوتے سے انداز میں اس نے جوابا کہا۔
 ”ڈاکٹر تیز تیز قدم اٹھاتی چلی گئیں۔ عدیل اسی جگہ بے حس و حرکت کھڑا
 رہ گیا۔“

اس کا بچہ۔ اس کا اور کوئل کا بچہ۔ ان کی محبت کی نشانی۔ اس دنیا میں
 آنے سے پہلے ہی چل بسا۔ ماں کی آغوش میں آنے سے پہلے ہی موت کی آغوش

میں جا سویا۔
 کس گناہ کی پاداش میں۔؟
 کیوں۔؟
 کیوں۔؟
 کیوں۔؟؟
 اس کا ذہن سمجھنے سے عاری تھا۔
 دل بے حد دکھی ہو رہا تھا۔ مگر۔ اچانک جیسے کسی غیبی طاقت نے اسے
 جھنجھوڑ ڈالا۔
 کوئل۔ کوئل۔ وہ موت و حیات کی کشمکش میں پڑی تھی۔
 ”اوہ۔! میں اسے بچا لوں گا۔ میں اسے بچا لوں گا۔ ہر صورت میں۔ ہر
 قیمت پر۔ میں اس کی زندگی کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ تک دینے سے
 دریغ نہیں کروں گا۔ کوئل میری محبت ہے۔ کوئل میری آرزو ہے۔ کوئل ہی
 میری زندگی ہے۔ وہی نہ رہی تو میں۔ میں۔ اوہ۔!“
 وہ تیزی سے فریج کے کمرے کی طرف بھاگا۔
 ”فری۔ فری۔“
 اس وقت سب اخلاق و آداب وہ بھلا بیٹھا تھا۔ آوازیں دیتا ہوا اس
 کے کمرے کے اندر جا پہنچا۔
 ”کیا ہوا۔؟“ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔
 ”کوئل کی طبیعت بہت خراب ہے۔ اسے ابھی ابھی ہسپتال پہنچانا ہے۔“

کول کی آنکھ کھلی۔ سفید لباس میں ملبوس اک نرس نے اس کی کلائی تھامی
 ہوئی تھی۔ وہ حیران سی رہ گئی۔ پھر اس نے ارد گرد دیکھا۔
 ”میں ہسپتال میں کب آئی؟“
 حیران ہوتے ہوئے نحیف سی آواز میں اس نے نرس سے پوچھا۔
 ”رات آپ کی طبیعت ناساز ہو گئی تھی نا۔ اس لیے آپ کو ہسپتال لانا پڑا۔“
 ”ہاں ہاں۔ مجھے یاد ہے۔“
 اسے گزشتہ رات کی تکلیف یاد آگئی۔
 ”کیا ہو گیا تھا مجھے۔؟“
 ”دیکھیے۔ ابھی ڈاکٹر راؤنڈ پر آرہی ہیں۔ وہ آپ کو سب کچھ سمجھا دیں گی۔“
 اس نے ابھی بات مکمل ہی کی تھی کہ مسکراتے چہرے والی ڈاکٹر اندر

تم جلدی سے ضرورت کی چند چیزیں اکٹھی کر دو۔“
 ”کیا ہوا باجی کو۔؟“
 اس نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔
 ”اس کو کچھ تکلیف ہے۔ وہ۔ وہ۔ پتہ نہیں کیا ہے۔؟“
 اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فریج کو کیسے سمجھائے۔
 ”میں ہسپتال فون کرنے جا رہا ہوں۔ تم اس کا دھیان رکھنا۔“
 اس نے جاتے جاتے غلبت سے کہا۔
 تھوڑی دیر بعد ایمبولینس آگئی اور کول ہسپتال چلی گئی۔ فی الحال فریج
 یا عدیل کی وہاں ضرورت نہ تھی۔ رات سرد تھی۔ برآمدوں میں ٹھٹھرنے کی بجائے
 انہیں گھرواپس بھیج دیا گیا۔
 اور پھر۔ باقی رات۔ عدیل ایک لمحہ کو بھی نہ سوسکا۔ تمام رات کول کے
 ساتھ گزارا ہوا ایک ایک لمحہ اس کی آنکھوں میں پھرتا رہا اور اسے بے قرار
 کرتا رہا۔
 ”یا اللہ! اسے صحت دے۔ خدایا اس کی زندگی قائم رکھنا۔ وہ نہ رہی تو
 عدیل بھی۔ عدیل بھی جان سے گزر جائے گا۔ وہی تو اس کے جسم میں رُوح
 ہے۔ پروردگار۔! پروردگار۔!!“

داخل ہوئیں۔

”صبح بخیر مسز عدیل! کب جاگیں آپ؟“

اس نے چارٹ پڑھتے ہوئے پوچھا۔

”جی ابھی آنکھ کھلی ہے۔ اور میں خود کو ہسپتال میں پا کر حیران رہ گئی

ہوں۔“

”جی ہاں۔ جب آپ رات کو یہاں لائی گئی تھیں تو آپ مارفیا کے زیر اثر

تھیں۔“

اس نے چارٹ رکھتے ہوئے کومل کے چہرے پر بھرپور نگاہ ڈالی۔

”مسز عدیل! میں آپ کو ایک خبر سنانا چاہتی ہوں۔“

وہ اس کے قریب جھک آئی۔ اس کا چہرہ بڑا مشفق اور انداز بڑا مخلص

سام تھا۔

”لیکن پہلے یہ سمجھا دوں کہ پریشان ہونے کی بالکل کوئی ضرورت نہیں۔“

”آپ فکر نہ کریں۔“

اندر سے دل دھک کر کے رہ گیا مگر بظاہر ہلکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر

بکھیرتے ہوئے کومل بولی۔

”میں ہر تکلیف خندہ پیشانی سے برداشت کر سکتی ہوں۔“

ڈاکٹر نے اس کے مسکراتے چہرے پر نگاہیں گارتے ہوئے بڑی نرم سی

آواز میں کہا۔

”آپ کا حمل ساقط ہو گیا ہے۔“

”جی۔“ اس کے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا۔ پھر اس کی آواز بھرا گئی اور

پیشانی پر ٹھنڈا پسینہ ابھرا آیا۔

”دیکھیے میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ایسے

حادثات تو تقریباً ہر ماں کو برداشت کرنا ہی پڑتے ہیں۔“

ڈاکٹر نے اسے تسلی دی۔

”تو مجھے کتنے دن ہسپتال میں رہنا ہوگا۔؟“

”یہی کوئی آٹھ دس دن۔ وہ بھی اس لیے کہ کوئی پیچیدگی نہ پیدا ہو جائے۔

اچھا اب میں چلتی ہوں۔ شام کو پھر آؤں گی۔ اب آپ ذہن پر کوئی فکر یا پریشانی

مت ڈالیں گا۔ خدا حافظ۔“

ڈاکٹر اور نرس دونوں باہر چلی گئیں۔

”میرا بچہ۔ جسے میں اپنا کہہ بھی نہ سکی۔ جس کے منہ سے ماں کا لفظ سننے کی

آرزو نے اس کے ساتھ ہی دم توڑ دیا۔ میرا بچہ۔ جسے میں دیکھ بھی نہ سکی۔“

اس نے آنسو روکنے کی بہت کوشش کی۔ مگر سینے پر اتنا بڑا بوجھ تھا

کہ وہ برداشت نہ کر سکی۔ آخر کار ضبط کے بند ٹوٹ گئے۔

”میرا بچہ۔ میرا بچہ۔“ وہ سسکیاں لینے لگی۔

اس کے اندر خواہش پیدا ہوئی کہ کاش وہ ایک مرتبہ۔ صرف ایک مرتبہ

اپنے بچے کو سینے سے لٹا سکتی۔ اس کا منہ چوم سکتی۔

اس خواہش کا ہلکا ہلکا درد کسی گہرے گھاؤ کی طرح ٹیسس مارنے لگا۔

کیسی کیسی آرزوئیں اس نے دل میں بسا رکھی تھیں۔ اس نے کیسے کیسے

سہانے سونے دیکھے تھے۔ اس چھوٹی ٹیسی دنیا کے۔ جس میں اس نے عدیل کو اور اپنے ہونے والے بچے کو آباد کر رکھا تھا۔

اس کو یوں لگا گویا اس کا بچہ اس سے روٹھ کر۔ اس کی دنیا کو ویران کر کے چلا گیا تھا۔

اس کے ساتھ اس نے اس گھر میں، برآمدوں میں، صحن میں، لان میں آنکھ مچولی کھیلی تھی۔

اور اب۔ سب درو دیوار خاموش تھے۔ اس کے ساتھ سسکیاں بھر رہے تھے۔

”آجاؤ۔ واپس آجاؤ میرے بچے۔“ وہ بلک پڑی۔

”میرے بچے واپس آجاؤ۔ میں تمہارے بغیر ادھوری رہ گئی ہوں۔ میری دنیا اجڑ گئی ہے۔ یہ دیکھو میں تمہیں ڈھونڈنے نکلی ہوں۔ اپنی ماں کو معاف کر دو۔ اور چپکے سے آکر میرے سینے کے ساتھ لگ جاؤ۔ دیکھو میں نے آنکھیں بند کر لی ہیں۔“

وہ تکیے کو سینے سے لپٹائے رو رہی تھی۔ اس کا نرم گرم لمس اسے تڑپائے دے رہا تھا کہ وہ بے جان تھا۔ اور اس کا سینہ اس جاندار ہستی کے لمس بنا ویران ہوا جارا تھا جس نے اسے زندگی کی خوشیاں دینا تھیں۔ جس نے اس کی تکمیل کرنا تھی۔

”واپس آجاؤ میرے لال۔ میرے بچے۔“

اور وہ یونہی سسکیاں بھرتے بھرتے سو گئی۔

دوپہر کے وقت عدیل اور فریحہ ہسپتال آئے۔ کوئل ان کے قدموں کی آہٹ سن کر جاگ پڑی۔

”باجی۔ باجی۔ کیا ہوا۔؟“

فریحہ حقیقت حال سے بے خبر تھی۔ اسی لیے گھبرائے ہوئے لہجے میں بار بار پوچھ رہی تھی۔

”ارے کوئل! تمہاری آنکھیں کیوں سرخ ہو رہی ہیں۔؟“

عدیل فریحہ کے ساتھ ہونے کی پرواہ کیے بغیر اس کے پاس آکر اس پر جھک گیا۔ پھر اس کے چہرے کے بہت قریب ہو کر اسے بغور تنگنے لگا۔

”نیند نہیں آئی یا روتی رہی ہو۔؟“ اس نے دیکھو سارا تکیہ بھیک رہا ہے۔ عدیل نے تکیے کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں۔ روتی تو نہیں۔“

اک پڑمردہ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھرا اٹھی۔ عدیل سمجھ گیا کہ وہ صاف جھوٹ بول گئی تھی۔ ورنہ وہ بہت سارا روتی تھی۔

”اری پگلی! پھر کیا ہوا۔؟“

عدیل نے اس کا ہاتھ تھام کر سہلایا۔ اس کی پیشانی پر سے بھرے بھرے بال پر سے ہٹائے۔

”ایسی کوئی رونے کی بات تو نہیں۔ بس اب جلدی جلدی ٹھیک ہو جاؤ اور چلو گھر۔“

وہ بڑے پیارے انداز میں اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

”سچ جانو تمہارے بغیر گھر بڑا سونا سونا لگتا ہے۔“
 ”ڈاکٹر کہتی تھیں بس آٹھ دس دن کی بات ہے۔“

کومل نے عدیل کا ہاتھ تھام لیا۔
 ”خود میں بھی جلد گھر جانا چاہتی ہوں۔ تمہارے سب کام۔۔۔“
 ”ارے کاموں کو ڈالو چلو ہے میں۔“

پھر اس نے مڑ کر فریج کی طرف دیکھا۔ وہ پیٹھ موڑے کھڑکی میں کھڑی
 باہر دیکھ رہی تھی۔ وہ کومل کے اور بھی قریب جھک آیا اور مسکراتے ہوئے
 اس کے کان میں بولا۔

”تمہاری یہ نرم نرم انگلیاں میرے بالوں میں نہیں ہوتیں تو مجھے نیند
 نہیں آتی۔ تمہارے یہ مرمیں بازو میرے گلے کا ہار نہیں بنتے تو مجھے قرار نہیں
 آتا۔ تمہارے وجود کے سحر انگیز لمس بنا۔۔۔“

کومل نے شرمناک گھبراہٹ اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔
 ”چپ۔ فری ہے۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”اوہ۔! لیکن وہ تو ادھر ہے۔“
 وہ جھنجھلا پڑا۔

”ایک تو یہ مصیبت ہر وقت۔۔۔“

”فری۔! کومل نے یکدم اسے آواز دے ڈالی تو وہ جلدی سے سیدھا
 اور خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔
 ”ادھر آؤ میرے پاس۔“

وہ اس کی چھوٹی ٹہن بھتی۔ اتنی گھبرائی ہوئی تھی۔ اتنی پریشان تھی۔
 بڑا رحم آیا اس پر۔!

اس کے بغیر بے چاری گھر میں اکیلی کیا کرتی ہوگی۔؟ فریج اس کے
 قریب آگئی۔

”میں جلد گھر آنے کی کوشش کروں گی۔ تم پریشان نہ ہونا۔“
 ”آج صبح ڈاکٹر دلاور کے ہاں سے رات کے کھانے کی دعوت آئی تھی۔“
 عدیل کو جیسے کوئی بھولی بات یاد آئی۔
 ”مگر میں نے فی الحال ٹال دیا ہے۔“

”ٹال دیا ہے۔؟ وہ کیوں۔؟؟“

کومل نے اسے گھور کر دیکھا۔

”تمہیں نہیں تھیں تو میں کیسے جاتا۔“

عدیل نے انتہائی پیار بھری نظر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں نہیں تھی تو کیا ہوا۔؟ فی کو لے جاتے۔ دیکھو عدیل! میری بہن

کا خاص خیال رکھنا۔ میرے بغیر اس نہ ہونے دینا۔ اسے رائیڈنگ کا بڑا
 شوق ہے۔ شام کو لے جایا کرنا۔ ورنہ اکیلی گھر میں گھبرایا کرے گی۔“

”نہیں باجی۔! فریج بولی۔“

”تم صحت یاب ہو کر آ جاؤ تو پھر بہت سارے پروگرام بنائیں گے۔“

”نو۔ اب تم میرے لیے اپنا وقت بھی ضائع کرتی رہو گی۔ جانے امی

ابا کب تمہیں واپس بلا لیں۔“

مچھروہ عدیل سے مخاطب ہوئی۔
 ”عدیل! تم فری کو لے کر ڈاکٹر دلاور کے ہاں چلے جانا۔ اور میری طرف
 سے معذرت کر دینا۔ تم دونوں کا دل ذرا بہل جائے گا۔“
 ”تو پھر شام کو شاید ہم نہ آسکیں۔“
 فریحہ گویا رضا مند ہوتے ہوئے بولی۔
 ”تو کیا ہوا۔؟“
 ”لیکن۔۔۔“ عدیل نے کچھ کہنا چاہا مگر کومل جھٹ سے بولی۔
 ”لیکن وہ کین نہیں۔ تم بس دعوت پر ضرور جانا۔“
 ”تمہاری خوشی۔“ عدیل بادل خواستہ بولا۔
 ”فری ہماری جہان ہے۔“
 کومل نے عدیل کو گویا اس کے فرائض کا احساس دلانے کی کوشش کی۔
 فریحہ پرس وغیرہ اٹھا کر جانے کو تیار تھی۔
 ”جو حکم جناب۔!“
 کومل کی طرف دیکھتے ہوئے وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔
 چند قدم چلا۔ پھر لوٹ آیا۔ فریحہ کمرے سے باہر نکل چکی تھی۔
 ”کیوں۔؟“ کومل نے واپس آنے کا سبب پوچھا۔
 ”رخصتی پیار تو دو۔ تاکہ اسی خیال، اسی سحر میں ڈوب کر کم از کم نیند کو تو
 اپنے پاس بلا سکوں۔“
 کومل نے مسکراتے ہوئے بازو پھیلا دیئے۔

دونوں اکٹھے ہی آئے۔ عدیل کچھ چپ چاپ سا تھا۔ آتے ہی کومل کے
 پاس بیٹھ گیا۔
 ”طبیعت کیسی ہے۔؟“
 اس نے کومل کا ہاتھ تھام کر بڑی گہری نگاہوں سے اس کی آنکھوں
 میں دیکھا۔
 ”ٹھیک ہوں۔“
 پھر کومل جلدی سے فریحہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ بڑی ہشاش بشاش
 دکھائی دے رہی تھی وہ۔!
 ”تم سناؤ فری۔؟“
 ”باجی! کل اتنا مزہ آیا کہ کیا بتاؤں۔؟“

وہ بچوں کے سے سرور انداز میں بولنے لگی۔
 ”شام کو کوئی گھنٹہ بھر رائیڈ نگ کی۔ اور ایک بار تو میں نے اتنی تیز
 گھوڑا دوڑایا باجی! کہ بس گرنے ہی لگی تھی۔ اور نیچے بہت گہری کھڈ تھی۔ اگر
 گر جاتی تو ہڈی پسلی ایک ہو جاتی۔“

”اے اللہ! فری تم ابھی تک سچے ہی رہیں۔“
 کوئل سچ سچ لرزا اٹھی۔ پھر بڑے ناصحانہ انداز میں بولی۔
 ”اب ایسی حرکتیں تمہیں زیب نہیں دیتیں۔ اپنے میں کچھ بڑاپن۔“
 ”ارے چھوڑو بھی باجی۔“

لاپرواہی سے اس نے کوئل کی بات کاٹ دی۔
 ”اور ماں شام کو دعوت میں بڑا لطف رہا۔ وہاں ایک صاحب ملے جو
 ماڈرن آرٹ کے دیوانے تھے۔ بس میری طرح۔“
 وہ بے تکان بولے جا رہی تھی۔

”اور باجی! وہ تو دو تین بار پیرس بھی ہو آئے ہیں۔ کہتے تھے پیرس
 جانے سے پہلے میں انہیں مل لوں۔ وہاں کے کئی مشہور فنکاروں کے نام وہ
 مجھے تعارفی خطوط دیں گے۔ کل میں ان کی تصویریں بھی دیکھنے جا رہی تھی۔“
 ”تو گویا تمہیں اپنے جیسا ایک دیوانہ اور مل گیا۔“

کوئل اس کی بچوں کی طرح بے پایاں خوشی دیکھ کر ہنس پڑی۔
 ”اے باجی! آرٹسٹ لوگ دیوانے ہی تو ہوتے ہیں۔“

”اور تم وہ مال روڈ والا واقعہ سنا تو بھول ہی گئی ہو فری۔“

پاس سے عدیل بولا۔
 ”کوئل سنو۔ کل ہم دونوں مال پر جا رہے تھے کہ ایک فقیر فی ہمارے پیچھے
 لگ گئی۔ کئی مرتبہ ڈانٹا ڈپٹا مگر اس نے تو پیسے لیے بنا ہماری جان نہ چھوڑنے
 کی گویا قسم کھا رکھی تھی۔ جانتی ہو کہتی کیا تھی۔؟“

کوئل دلچسپی سے سننے لگی۔
 ”پہلے مجھے مخاطب کر کے کہنے لگی۔ بیٹا! تم دونوں کی جوڑی بنی رہے۔!۔
 عدیل اسی کے لہجے اور انداز کی نقل اتار رہا تھا۔
 ”پھر فری کو کہنے لگی۔ بیٹی! سدا سہاگن رہو۔ سات بیٹوں کی ماں بنو۔
 اور نجانے کیا کیا کہتی رہی۔“

عدیل بے ساختہ ہنس رہا تھا۔
 ”فری کی بڑی عجیب حالت تھی۔ آخر تنگ آکر میں نے پچاس پیسے دیئے
 اور جان چھڑائی۔“

یہ واقعہ سننے ہی کوئل کے دل میں جذبات کی ایک عجیب سی لہر اٹھی۔
 شک۔؟ حسد۔؟؟ یا رقابت۔؟؟؟
 وہ فیصلہ نہ کر پائی کہ کیا تھا۔؟

اس نے عدیل کے چہرے کو بغور دیکھا۔ مگر اسے وہاں کوئی مشکوک تاثر
 نظر نہ آیا۔ اس نے بڑی سادگی اور صاف دلی سے سب کچھ بتا دیا تھا۔
 پھر اس نے فوراً فریج کی طرف دیکھا۔ وہ کھڑکی میں کھڑی بڑے مزے
 سے چیونٹے چبا رہی تھی۔

”کیا بات ہے کومل۔! تم کچھ پریشان سی ہو۔“
عدیل نے حیرت سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔
”نہیں نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔“
وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

”جانے میں کیوں اتنی شکی مزاج ہوتی جا رہی ہوں۔“ اس نے دل میں چاہا۔
کومل خاموش ان دونوں کو تک رہی تھی۔ عدیل نے بڑے پیار سے کہا۔
”اب تم بھی کوئی بات سناؤ نا۔؟“
”میں سناؤں۔؟ یہاں ہسپتال کے ایک کمرے میں میں پڑی ہوں۔“
کومل قدرے بے بسی سے بولی۔

”اٹھتے بیٹھتے کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں۔ میں کیا سناؤں۔؟“
عدیل ہنس پڑا۔ پھر ہونے سے سرگوشی کے سے انداز میں کہ فریجی نہ سن
ے، کہنے لگا۔

”پگلی! تم بے شک یہیں پڑی رہو۔ میں تمہیں کوئی ارد گرد کا واقعہ سنانے
کو تو نہیں کہہ رہا۔ میرا جی چاہتا ہے تم مجھ سے میرے متعلق باتیں کرو۔ اس
تنہائی میں یوں اکیلے پن میں، میں تمہیں کیسے کیسے یاد آیا ہوں۔“
”اوہ۔!“ کومل مسکرا پڑی۔ چپکے سے عدیل کا ہاتھ تھام کر دبا یا۔ اس کی
آنکھوں میں بڑی انوکھی سی خوبصورت سی چمک لہرائی۔

عدیل مسحور سا ہو گیا۔ فریجی موجود نہ ہوتی تو اس نے اس وقت کومل کی
آنکھوں کو چوم لینا تھا۔ وہاں چمکتے ستاروں کو اپنے ہونٹوں پر سجا لینا تھے۔

اور ہونے سے اس نے اپنے اس ارادے کا کومل پر اظہار بھی کر دیا۔ اس
کی آنکھوں کی چمک کچھ اور گہری ہو گئی۔
اس لمحے۔ کومل کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ دنیا کی خوش قسمت ترین
عورت تھی کہ اسے ایک مرد کا والہانہ پیارا اتنی گہری محبت اور امنٹ
اعتماد حاصل تھا۔

عدیل کا مضبوط ہاتھ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا۔
”اب چلیں عدیل۔!“
فریجی یکایک مڑی۔ وہ سحر ٹوٹ گیا۔ پیار کا نغمہ بکھر گیا۔ دونوں ہی چونک
پڑے۔

”کھڑوا بھی۔“ کومل نے اصرار کیا۔
”میں جانتا ہوں اسے کس بات کی جلدی ہے۔!“
عدیل نے مسکراتے ہوئے مڑ کر فریجی کی طرف دیکھا۔
”کومل! آج اس نے فلم کا پروگرام بنایا ہے۔“
”نہیں نہیں۔“ فریجی یکدم گھبرا اٹھی۔
کومل نے تعجب سے اس کی گھبراہٹ کو دیکھا۔
”ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے تو سوچا تھا کہ باجی کو آرام کا موقع دیا
جائے۔“

کومل کے دل میں شکوک نے پھر سر اٹھار۔ فریجی زیادہ سے زیادہ وقت
عدیل کے ساتھ تنہائی میں گزارنا چاہتی تھی۔ کیوں۔؟

اس کے علاوہ اپنے پروگراموں سے وہ اسے لاعلم بھی رکھنا چاہتی تھی۔
کیوں؟؟

کہیں وہ اس پر اپنی اس محبت کا اظہار تو نہیں کرنا چاہتی تھی جسے
وہ کئی سالوں سے اپنے سینے میں چھپائے ہوئے تھی۔

مگر اب کیوں؟ اب کیوں؟
کیا اسے یہ احساس نہیں تھا کہ وہ کسی اور کا ہو چکا تھا۔ اب وہ اس کی
بہن کا شوہر تھا۔

حقیقی بہن کا۔ کیا اس صورت میں بھی؟

کیا فری اس پستی تک گر سکتی تھی؟

”نہیں نہیں۔ یہ ممکن نہیں۔ سب میرا وہم ہے۔ سب میرے پراگندہ
خیالات ہیں۔ اس تنہائی کے جھوٹ۔“

اس نے دل کو تسلی دی۔ مگر یہ احساس دل سے نہ نکال سکی کہ وہ تسلی
جھوٹی تھی۔

وہ چپ چاپ سوچوں میں کھوئی پڑی تھی۔ نرس کمرے میں داخل ہوئی تو
اسے پتہ ہی نہ چلا۔ اتنی گم تھی وہ۔!

”کیا بات ہے مسز عدیل! آپ کو بخار کیوں آنے لگا ہے۔ ڈاکٹر کہہ رہی
تھیں کہ آپ کو آرام آ جانا چاہیے تھا۔ مگر۔“

”مگر کیا؟“ اس نے چونک کر نرس کو دیکھا۔

”شاید آپ ہسپتال سے ابھی جانا نہیں چاہتیں۔“

”ہسپتال سے جانا نہیں چاہتی۔“

اک مجروح سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

”میرے بغیر میرا گھر برباد ہو رہا ہے نرس! میں کیسے نہ یہاں سے جانا

چاہوں گی۔“

”گھر برباد ہو رہا ہے۔“ نرس متعجب سی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔
”کیا بات ہے۔؟“

”اوہ! آپ میرا مطلب غلط سمجھی ہیں۔“
وہ سٹپٹا کر بولی۔

”جب گھر کی مالکن گھر میں موجود نہ ہو تو گھر کی دیکھ بجال پھر اس طرح تو نہیں ہوتی نا۔“

”ہاں۔ یہ تو آپ نے سچ کہا۔ اب مجھے ہی لیجیے۔ صرف ڈیوٹی کے اوقات ہی گزار کر گھر جاتی ہوں تو ہر چیز بے ترتیب پڑی ملتی ہے اور آپ تو کئی دن سے گھر سے غیر حاضر ہیں۔“
”ہاں۔“

”تو پھر آپ ذہن میں اچھے اچھے خیالات لائیے۔ زندہ سوچوں سے زندگی کو تقویت ملتی ہے۔ پر اگندہ ذہن، بیمار سوچیں، انسان کو زیادہ بیمار کر دیتی ہیں۔“
نرس اسے سمجھانے لگی۔

”اب یہی دیکھیے آپ کو تین دن پہلے یہاں سے چلے جانا چاہیے تھا۔ مگر آپ کو بخار آنے لگا ہے۔ یقیناً کوئی ذہنی گڑبڑ ہے۔ اور جانے کتنے دن اور اب آپ کو یہاں رہنا پڑ جائے۔“

”نہیں نہیں۔ میں جلد اچھی ہو کر گھر جانا چاہتی ہوں۔ میں اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔ جلد از جلد۔“

وہ کتنی ہی دیر بڑبڑاتی رہی۔ نرس اس کا ٹیپر پچر لے کر چارٹ پر لکھ کر دوا پلا کر رخصت ہو گئی۔

اور وہ پھر اپنی سوچوں کے ساتھ تنہا رہ گئی۔
پچلے چند دنوں سے فری میں وہ ایک نمایاں تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔ اب وہ دن میں صرف ایک مرتبہ آتی۔ وہ بھی چند منٹ بیٹھنے کے بعد واپس چلنے کا تقاضا شروع کر دیتی۔

”چلو عدیل! چلیں۔“

ہر دن سینکڑ بعد وہ یہی فقرہ دہراتی۔ ابتدا میں تو عدیل کبھی اس کی سنتا ہی نہ، پھر کبھی اسے چند منٹ، چند منٹ اور رک جانے کا کہہ کر کچھ وقت گزار لیتا۔ مگر پھر۔

اب تو وہ بھی فری کے ذرا سے اشارے پر فوراً اٹھ پڑتا تھا۔

”اچھا کول! اب تم آرام کرو۔“

ہمیشہ اسے آرام کرنے ہی کی تلقین کی جاتی۔

”آرام کروں۔؟ وہ دل ہی دل میں سوچتی۔

”آرام کروں۔ جبکہ میری بہن میرے شوہر کے ساتھ دن بھر سیر سپاٹے کرتی پھرے۔“

چوبیس گھنٹوں میں سے اس سے ملاقات کا ایک آدھ گھنٹہ نکال کر باقی بچانے کتنا وقت دونوں اکٹھا گزارتے تھے۔

دونوں۔ اس کی بہن۔ اس کا شوہر۔!

فری - عدیل - !

وہ عدیل - شادی سے پہلے جس کے ساتھ فری محبت کیا کرتی تھی -
اور اگر اس نے اس جذبے کو وقتی طور پر دبا ہی دیا تھا تو کیا ممکن نہیں
تھا کہ ہر وقت اکٹھا رہنے کی وجہ سے وہ چنگاری شعلہ بن جائے - ؟

اور - پھر وہ شعلہ اس کے پرسکون گھر کو جلا کر راکھ کر دے - ؟
اس سوال کا جواب کون دے سکتا تھا - ؟ اس پہیلی کو کون حل کر سکتا تھا؟
کاش ! وہ ہسپتال داخل نہ ہوتی ہوتی -

پھر شاید یہ سب کچھ وقوع پذیر نہ ہوتا - !

مگر اب کیا ہو سکتا تھا - ؟

جنگل کی آگ کو پھیلنے سے کون روک سکتا تھا - ؟ لیکن - لیکن وہ اس کا
ذمہ دار کس کو ٹھہرائے - ؟

قصور وار کس کو کہے - ؟

عدیل کو - ؟ جس نے عمر بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا - جو اس پر جان

دیتا تھا -

نہیں - عدیل بے وفا نہیں ہو سکتا -

فریحہ کو - ؟ لیکن وہ اتنی بے رحم نہیں ہو سکتی کہ اپنے دامن کو وقتی مسرتوں
سے بھرنے کے لیے اپنی بہن کا دامن انگاروں سے بھر دے -

خود اپنے آپ کو - ؟

وہ اس وقت کو کوستی تھی جب اس نے خود ہی فری کو اپنے پاس بلایا

تھا - سب کچھ جانتے ہوئے بھی دونوں کو اکٹھا رہنے کا موقع دیا تھا -
مگر - قصور اس کا بھی نہیں تھا - وہ جان بوجھ کر تو بیمار نہیں ہوتی تھی -
وہ تو اچانک - اچانک بیمار پڑ گئی - ایسی بیمار - کہ اسے ہسپتال داخل ہونا پڑا -
یہاں آکر بھی وہ جلد ٹھیک نہ ہو سکی - اس کی بد قسمتی نے اسے توقع سے
زیادہ دن یہاں رکھ لیا -

اور وہ دونوں اب تنہا تھے - دن رات تنہا - کسی قسم کی دخل اندازی
سے بے خطر - !

اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ جیسے وہ ان دونوں کو اکٹھے بیٹھا دیکھ
رہی تھی -

فریحہ کا سر عدیل کے سینے پر ٹکا تھا - وہ اپنی انگلیوں سے اس کے بالوں
میں گنگھی کر رہا تھا - فری نے یکایک چہرہ اونچا کر کے پوچھا -

"عدیل ! تمہیں میری قسم ! سچ سچ بتانا - تمہیں مجھ سے زیادہ محبت ہے یا
باجی سے - ؟"

"زیادہ محبت کس سے - ؟" عدیل مسکرایا -

"پگلی ! مجھے تو صرف تم سے محبت ہے -"

"تو پھر تم نے باجی سے شادی کیوں کی - ؟"

فری نے بڑی اداسے پوچھا -

"اپنی اس غلطی کا ازالہ تو میں عمر بھر نہیں کر سکتا فری - !"

عدیل نے اداس ہو کر جواب دیا -

محسوس کر کے انسانی ہمدردی کے ناطے کڑھا جاسکتا ہے۔

اور۔ وہ پچھلے کئی دنوں سے کڑھ رہی تھی۔

وہ خود اس سے کہنا چاہ رہی تھی کہ وہ اب واپس گھر چلی جائے۔

اگر بالکل تندرست نہیں ہوئی تھی تب بھی یہاں سے چلی جائے۔

اپنی منزل کی طرف لوٹ جائے کہ وہ گم ہوئی جا رہی تھی۔ !!

جانے اس تجربہ کار نرس نے ڈاکٹر کو اس کے متعلق کیا رپورٹ دی۔ اگلی ہی صبح کو مل کو ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا۔

کوئل کی خواہش کے مطابق اس کے گھر اطلاع نہیں دی گئی۔ بلکہ اس نے خود ہی ٹیکسی کے ذریعے گھر جانا پسند کیا۔

نرس نے بیرے سے کہہ کر ٹیکسی منگوائی۔ اس کا سارا سامان رکھوایا اور بھانپک تک خود اسے رخصت کرنے گئی۔

کوئل گھر میں داخل ہوئی تو اس نے دیکھا کہ فریج کھانے پینے کی چیزیں ایک ٹوکری میں بند کر رہی تھی۔

”با جی!“

اسے دیکھتے ہی وہ حیران ہو کر قدرے بلند آواز میں بولی۔

”فری! میرے خیال میں آج پروگرام ملتوی کر دیں۔ کوئل اتنے دنوں کے بعد گھرائی ہے۔ اور اگر ہم چلے گئے تو بے چاری اکیلی بور ہوگی۔“
”جیسی تمہاری مرضی۔“

فریج نے بے دلی سے کہا اور ٹوکری دیں چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
”نہیں نہیں فری! میری وجہ سے اپنا پروگرام خراب نہ کرو۔ جاؤ تم دونوں چلے جاؤ۔ میں اکیلی بالکل بور نہیں ہوں گی۔ اتنے دن ہسپتال میں رہ کر عادت پڑ گئی ہے۔“

عجب زہریلی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر تیر گئی۔

”میں نے تو ویسے بھی سارا دن سو کر ہی گزارنا ہے۔“

نہ کسی نے اس کی مسکراہٹ کی طرف توجہ دی۔ نہ اس کا خیال کیا چیزیں سمیٹ سماٹ دونوں رخصت ہو گئے۔

کوئل نے آنکھوں میں آتے ہوئے آنسوؤں کو بڑی مشکل سے پیا اور پھر کپڑے بدل کر چپ چاپ بستر میں جا گھسی۔

چھ سات دن سے خیر و بھی چھٹی پر گیا ہوا تھا۔ یہ اسے عدیل اور فری کی زبانی ہسپتال میں ہی معلوم ہوا تھا۔

خود گیا تھا۔ یا انہوں نے چھٹی دی تھی۔ یہ کوئل کو علم نہیں تھا۔ البتہ اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس نے چھٹی مانگی نہیں تھی بلکہ دی گئی تھی۔ اپنی آزادی کی خاطر۔!

اور یوں۔ آج وہ گھر میں تنہا تھی۔ بالکل تنہا۔ پانی تک پوچھنے والا کوئی

”تم اکیلی ہی آگئی ہو۔ ہمیں بلوا لیا ہوتا۔“
”ایک ہی بات ہے۔ میں وہاں پڑے پڑے تنگ آگئی تھی۔ ڈاکٹر نے بھی چھٹی دے دی تھی۔ سوچا۔ چلو تمہارے لیے ایک سرپرائز ہی سی۔“
کوئل نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

اس کی آواز سن کر ڈرلینگ روم سے عدیل نکل آیا۔ اس نے باہر جانے کے لیے لباس تبدیل کیا ہوا تھا اور ٹانی کی گرہ لگا رہا تھا۔

”ارے کوئل! بل گئی چھٹی یا خود ہی بھاگ آئی ہو۔؟ اور سچ مانو بڑے اچھے وقت پر آئی ہو۔ ہم دونوں کشمیر پوائنٹ پر جا رہے تھے۔ چلو گی نا۔؟“

”نہیں بھتی! ابھی تو مجھے زیادہ چلنے پھرنے کی اجازت نہیں۔ اور اں کسی اور کو بھی بلایا ہوا ہے۔؟“

اس نے عدیل سے پوچھا۔ جانے کیا ہوا۔ اسی لمحے فری کے ہاتھ سے گلاس گر کر چھناک سے ٹوٹ گیا۔

”افوہ! میں بھی کتنی پھوہڑ ہوں۔“

فریج ہنس کر بولی۔

”چلو کوئی بات نہیں۔“ کوئل نے جلدی سے کہا۔

لیکن۔ اس کے اندر سے کہیں سے یہ سدا اٹھ رہی تھی کہ اس کا سوال ٹانے کے لیے جان بوجھ کر فری نے یہ حرکت کی تھی۔

اس کا جی چاہا کہ ایک مرتبہ پھر اپنے سوال کو دہرائے۔ مگر پھر خاموش

ہی رہی۔

پاس نہ تھا۔

وہ اپنی تنہائی کو گلے لگائے خاموش پڑی تھی۔ وہ دونوں یوں چلے گئے تھے جیسے کوئی کسی کی زندگی سے چلا جائے عجیب دکھ بھرے اور پریشان کن خیالات نے اسے آگھیرا۔

انہیں کے متعلق سوچتے سوچتے اسے یوں گنے لگا جیسے وہ ان دونوں کو جانتے دیکھ سکتی تھی۔

ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر یوں چل رہے تھے گویا بنے ہی ایک دوسرے کے لیے تھے۔

اور شاید یہ ٹھیک ہی تھا۔ خود اس کی نسبت فری عدیل کے لیے زیادہ موزوں تھی۔ اس پر گویا انکشاف ہوا۔

وہ دونوں ہم عمر تھے۔ اور ہم عمروں کی طبیعت ایک مزاج ایک سا ہوتا ہے۔ وہ عدیل سے بڑی تھی۔ عمر کے ساتھ ساتھ طبیعت اور مزاج میں بھی تفاوت تھا۔ تبھی تبھی۔

یہ ایک اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے ایک دم اس کے چہرے پر شبہ مار جھریاں پڑ گئی تھیں۔ اور وہ سب جھریاں عدیل کو نظر آنے لگی تھیں۔

”اوہ۔“ وہ اپنے رخساروں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ پھر اپنے نازک نازک خوبصورت ہاتھوں کو بڑے غور سے اگھور اگھور کر دیکھنے لگی۔

اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے ہاتھ بھی عمر نے بد نما کر دیئے تھے۔ اس کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

”میں نے کہا تھا نا کہ یہ سب درست نہیں۔ پھر۔ پھر عدیل کو اس کا احساس اس وقت کیوں نہ ہوا۔ کیا اس حقیقت تک پہنچنے کے لیے اسے میری زندگی کو روندنا ضروری تھا۔ میرے جذبات و احساسات کو تاراج کرنا لازم تھا۔ میرے شیشہ دل کو چور چور کیے بغیر گزارنا تھا۔؟“

وہ عدیل کے بستر کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھنے لگی۔ گویا اس سے جواب مانگ رہی تھی۔

”بولو۔ بولو۔ میری زندگی کس گناہ کی پاداش میں تباہ کی جا رہی ہے۔؟“

میرے دل پر یہ کچھ کے کیوں لگاتے جا رہے ہیں۔؟ مجھے بے موت کیوں مارا جا رہا ہے۔؟ مجھے زندہ درگور کیوں کیا جا رہا ہے۔؟ بولو۔ بولو۔

مگر سکوت ٹوٹ نہ سکا۔ اور اس کے آنسو بڑی خاموشی سے بہتے رہے۔ جانے کب تک وہ ان دھاروں سے مڑ مڑاتی رہی۔ جب طوفان وار تھا۔ دل کا غبار قدر کم ہوا۔ تو اس نے آنکھیں کھول کر ارد گرد دیکھا۔

یہ اس کا اپنا گھر تھا۔ کتنی محنت اور کس سلیقے سے اس نے سجایا سنوارا تھا۔ یہ اس کی خواب گاہ تھی۔ کتنی رومان پرور اور ذہنی و جسمانی آسائش دینے والی۔ کتنی خوبصورت راتیں عدیل کے ساتھ اس نے یہاں گزاری تھیں۔

یہ اس کے بستر کے ساتھ ملا ہوا عدیل کا بستر تھا۔ اس کا اپنا عدیل جو کبھی اپنا تھا۔

نہیں نہیں۔ یہ سب اس کا وہم تھا۔ وہ اب بھی اس کا اپنا ہی تھا۔ کروٹ بدل کر اس نے عدیل کے بستر کی طرف رخ موڑ لیا۔ بڑے پیار

اور محبت سے اس کے بستر پر یوں ہاتھ پھیرنے لگی جیسے وہ عدیل تھا۔
”سنو عدیل!“

اس سے بات کرنے کے لیے کوئل نے تکیے کی جانب دیکھا۔ اور عین اس جگہ جہاں عدیل کا چہرہ سجا کر وہ بات کر رہی تھی۔ تکیے کے نیچے سے کسی تصویر کا کونا جھانک رہا تھا۔

وہ چونک پڑی۔ بات ادھوری رہ گئی۔

ہاتھ بڑھا کر اس نے تصویر نکالی۔ دیکھی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آنکھوں کو ملا۔ پھر دیکھا۔

اور اب اسے یوں لگا گویا اس کے تمام شکوک و شبہات اور وہم ڈرائے جھوٹ بن کر اس کے گرد و چینیں مار مار کر ناچنے لگے تھے۔

گویا دیواریں سٹٹنا شروع ہو گئی تھیں۔ کچھ اس انداز سے۔ جیسے اسے پس ہی ڈالیں گے۔

تصویر میں فری اور عدیل ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ فری نے عدیل کی بغل میں سے بازو نکال کر اس کے کندھے پر رکھا ہوا تھا۔

ان کے خوبصورت چہروں پر اطمینان اور مسرت رقصاں تھا۔ فتح یاب جذبات کے تحت۔ کامیاب انسانوں کی طرح!!

کوئل نے گہرا کر تصویر اُلٹ دی۔

اس محبت کی یاد میں۔ جو کھو کر پائی گئی۔ فریجہ! اک تیر اور لگا۔

اس نے گہرا کر تصویر کو وہیں واپس رکھ دیا۔ زخموں سے ٹپسیں اٹھنے لگیں۔
آخر وہی ہونا جس کا اسے خدشہ تھا۔ کیا فری واقعی اتنی پست کردار تھی۔؟

عدیل کیا واقعی بے وفا تھا۔؟

انسان کے ظاہر اور باطن میں اتنا تفاوت۔

بہن! بہن کو مٹانے پر آمادہ۔!

شوہر بیوی کو دغا دینے کے لیے تیار۔!

اور ہر زخم کسے سہنا پڑا۔؟ خمیازہ کسے بھگتنا پڑا۔؟

اسے۔ اس بے گناہ کو۔ جسے دونوں سے محبت تھی۔ جو دونوں کی بہتری

چاہتی تھی۔ جو دونوں کے لیے جان دینے کو تیار تھی۔

اور اسی وفا و محبت کے پیکر سے دونوں نے غداری کی تھی۔

کیوں؟ انہوں نے ایسا کیوں کیا تھا۔؟؟

وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

اب۔ وہ سوچنے لگی۔ بڑے ٹھنڈے دماغ سے۔ بڑے صبر و برداشت

سے۔ کہ خدا نے اسے بہت بڑا دل دیا تھا۔ بہت بڑا حوصلہ دیا تھا۔

اسے کیا کرنا چاہیے تھا۔؟ کیا کرنا چاہیے تھا۔؟؟

اُن کے راستے سے ہٹ جائے یا اپنا، ایک بیوی کا، ایک بہن کا حق

منوانے کے لیے ڈٹ جائے۔

وہ سوچ رہی تھی۔

اس صورت میں دونوں میں سے ایک کو شکست تسلیم کرنا تھی۔ اسے
یا فری کو۔ اور اس کا فیصلہ عدیل کے ہاتھ میں تھا۔
لیکن۔ معاً اسے خیال آیا۔

جب منصف ہی مجرم کا طرفدار تھا تو انصاف کی امید کس سے اور کیسے
ہو سکتی تھی؟

تب اس کے دماغ نے اسے سمجھایا۔ اسے ان دونوں کے درمیان حائل
ہونے کا حق ہی کیا تھا۔؟ وہ دونوں ایک دوسرے کو پیار کرتے تھے۔

وہ تو فضول درمیان میں آرہی تھی۔ وہ پاگل تھی۔ اس پر پھیری تھی!!
”تو۔ تو کیا میں ان کو پوری آزادی سے ملنے دوں۔ محبت کی پینگیں،
بڑھانے کا موقع دوں۔ اور خود۔ خود الگ بیٹھی ان کے مسرت سے برز قہقہے
سنتی رہوں۔ اور اندر ہی اندر سلگتی رہوں۔؟“

وہ سوچوں میں کھوئی تھی۔

”مگر نہیں۔“ اس کی تمام حسیات چیخ پڑیں۔

”میں ایک عورت ہوں۔ ایک بیوی ہوں۔ جو شوہر کی محبت کے سوا
اور ہر چیز میں دوسروں کو شریک کر سکتی ہے۔ عدیل میرا خاوند ہے۔ میں
اس کی محبت میں کسی کو بھی شریک نہیں کروں گی۔ فری کو کیا خدا کو بھی نہیں
محبت کے جھٹے بخرے تو نہیں کیے جاتے۔ محبت تو ایک اکائی ہے۔ جو یا ہے
یا بالکل نہیں ہے۔“

عدیل کو یہ فیصلہ کرنا ہو گا کہ وہ اپنی محبت کے پھول کس کی جھولی میں

ڈالنا چاہتا ہے۔ میری یا فری کی۔؟

”اور اگر۔ عدیل نے مجھے ٹھکرا دیا تو۔؟“

اس خیال سے وہ لرز اٹھی۔ اس کی ساری ہستی کانپ گئی
”تو میری دنیا اندھیر ہو جائے گی۔ کر مجھے عدیل سے محبت ہے۔ جذباتی
قسم کی نہیں۔ میں نے تو اسے دل سے نہیں دماغ سے چاہا ہے۔ اس کے بغیر
تو مجھے موت بھی قبول نہ ہوگی۔ لیکن نہیں۔“

اس کے خیالات نے پھر اسے سنبھالا دیا۔

عدیل اسے نہیں ٹھکرا سکتا تھا۔ اس نے زمانے سے ٹکرے کر، لوگوں
کے خلاف چل کر اسے اپنا یا تھا۔ اب وہ اسے کیسے چھوڑ سکتا تھا۔؟
اور پھر کس کے لیے۔؟ فری کے لیے۔؟

انسانی فطرت نے سرا بھارا۔

”مگر فری کو کون سے سرخاب کے پر لگے ہوتے ہیں۔؟ وہ مجھ سے کس

طرح بہتر ہے۔؟“

اس کی خود داری، اس کی خود اعتمادی جاگ پڑی۔

”میں اپنا حق واپس لوں گی۔ میں عدیل کو واپس لانے کے لیے
فری جیسی ہزار لڑکیوں سے ٹکرے سکتی ہوں۔ مجھ میں کوئی کمی نہیں۔ میرے
پاس دماغ ہے۔ میرے پاس عقل ہے۔ اور۔ وہ میرا ہے۔ اسے مجھ سے
محبت ہے۔ مجھ سے۔ کوئل سے۔“

انہیں خیالوں میں کھوئے کھوئے جانے کب میند کی مہربان دیوی
نے اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

ان کے چہروں سے ہٹالیں۔

”رات ہو چلی ہے باجی! اور مجھے کھانا بنانا ہے۔ آپ کو بھوک لگ رہی ہوگی۔“

فریحہ تیز تیز سانس لیتے ہوئے بولی۔

”میں تو عدیل سے کہتی رہی کہ جلدی چلو۔ جلدی چلو۔ باجی ابھی کھانا بنانے کے قابل نہیں۔ مگر انہوں نے ایک ہی ضد رکھی کہ پہلے سیٹنگ کریں گے پھر واپس جائیں گے۔ پورا ایک گھنٹہ سیٹنگ کی تب کہیں ان کی تسلی ہوتی۔ اور میں تھک کر چور ہو گئی ہوں۔“

”بھئی مجھے تو بھوک نہیں۔“

بڑی کوشش سے کول نے اپنی آواز میں وہی نرمی، وہی مٹھاس پیدا کی جو اس کے مزاج کا خاصہ تھی۔

”تم لوگوں نے کچھ کھانا ہے تو ہوٹل میں چلے جاؤ۔“

”نہیں باجی! ہمیں بھوک کہاں؟ آتی دفعہ چائے پی تھی۔ اور ساتھ بہت

کچھ کھا لیا تھا۔“

درد کی ایک اور لہر اٹھی۔

وہ جانتے تھے کہ وہ اکیلی تھی اور ابھی اس میں اتنی طاقت نہ تھی کہ اٹھ کر

اپنے لیے چائے بھی بنا سکتی۔ تب بھی وہ باہر سے ہی کھاپی کر اور پیٹ بھر کر آتے تھے۔

یہ کیسی دنیا تھی۔؟ کیسی محبتیں اور کیسی وفائیں تھیں۔؟

اور جہاں محبتیں ٹوٹتی ہیں، مٹتی ہیں تو کیا انسانی ہمدردی بھی وہاں سے

شام ڈوب رہی تھی۔

فریحہ اور عدیل واپس آئے۔ بڑے مسرور تھے۔ کول نے باری باری دونوں

کو نگاہ بھر بھر دیکھا۔

اسے یوں لگا گویا ان کے چہروں پر لکھا تھا۔

”وہ ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔“

گویا اقرار کے بول ابھی تک ان کے ہونٹوں پر لرز رہے تھے۔

”میں تمہارا ہوں فری۔!“ اور۔

”عدیل! میں تمہاری ہوں۔ ہمیشہ سے۔ ہمیشہ کے لیے۔!“

ہر طرف سے اک گونج سی اس کے کانوں میں اتر رہی تھی۔

اس نے بے قرار ہو کر دونوں ہاتھوں سے اپنے کان بند کر لیے اور نگاہیں

رخصت ہو جاتی ہے۔؟؟

آنکھوں میں بہت سارے دکھ سمٹ آئے۔ وہ تیزی سے پلکیں جھپکنے لگی۔
کہ اپنی بے بسی کا اظہار کسی پر بھی کرنا نہیں چاہتی تھی
”اچھا باجی! میں تو سونے جا رہی ہوں۔ شب بخیر!“
فری لا پرواہی سے کمرے سے نکل گئی۔

کومل چپ چاپ پڑی کچھ سوچتی رہی۔ کیا۔؟ یہ وہ بھی نہیں جانتی تھی۔
عدیل شاید غسل خانے میں تھا۔ تھوڑی دیر بعد شب خوابی کا لباس پہنے
ہوئے گویا سونے کو تیار آگیا۔

”سارا دن سوئی رہی ہو کومل۔؟“

”نہیں۔ یونہی لیٹی کچھ سوچتی رہی ہوں۔“

اس نے نگاہ بھر کر عدیل کی طرف دیکھا۔

”طبیعت تو ٹھیک ہے۔؟“

اس نے لیٹتے ہوئے اس لہجہ میں پوچھا جیسے کوئی بیگاڑ مارے۔ یا جیسے کندھے

پر پڑا بوجھ بے پرواہی سے جھٹک کر اتار پھینکے۔

الفاظ میں، انداز میں، وہ خلوص، وہ گرمی نہ تھی۔ جس سے جاگتے جذبوں

کا اظہار ہوتا ہے۔ بہت سرسری سا لہجہ تھا۔

”ہاں۔ اب تو ٹھیک ہوں۔“

”بتی گل کر دوں۔؟ مجھے بڑی نیند آرہی ہے۔“

اس کے لیے نیند ہی رہ گئی تھی۔؟ تڑپ کر اس نے عدیل کی طرف دیکھا۔

مگر وہاں پھر وہی لا پرواہی کی پرچھائیاں دکھائی دیں۔
حلق میں کچھ اٹکا جا رہا تھا۔ آواز بھرائی جا رہی تھی۔ مگر بڑی شکل سے
نارمل کر سکی۔ تبھی صرف دو لفظ ہی بولی۔
”ہاں کر دو۔“

عدیل نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیپ بجا دیا۔ کومل کو یوں لگا جیسے اس کی
حیات کی نوکسی نے بجا دی تھی۔

کتنی ہی دیر اندھیرے میں ہی پڑی وہ چھت کو بے معنی نظروں سے گھومتی
رہی۔ دکھائی تو کچھ بھی نہیں دے رہا تھا مگر دماغ کی آنکھیں روشن تھیں۔ اپنا
راستہ تلاش کیے جا رہی تھی۔

کیا وہ عدیل سے بات کرے۔؟

کس طرح شروع کرے۔؟

کیا کہے۔؟

عدیل کا رد عمل کیا ہوگا۔؟

کیا وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرے گا۔؟

یا۔ اپنی نئی محبت کا۔؟

اور اگر اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ فری سے محبت کرتا تھا۔ تو۔ تو وہ کیا

کرے گی۔؟

کہاں جائے گی۔؟

یہ سوال اس کے ذہن میں گھوم رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا

”تمہیں مجھ سے بہت محبت ہے نا۔؟“

”ہاں۔ مجھے تم سے بہت محبت ہے۔ لیکن اس وقت۔؟“

اس کی آواز میں جھلاہٹ پیدا ہو گئی۔

”تم دنیا میں سب سے زیادہ مجھ سے پیار کرتے ہونا۔؟“

”یہ تو میں تمہیں کئی سالوں سے کہہ رہا ہوں۔“

”نہیں۔ اب پھر کہو کہ تم دنیا میں سب سے زیادہ مجھے چاہتے ہو۔“

”ہاں کوئل! تم مجھے دنیا میں سب سے زیادہ محبوب ہو۔“

”سب سے زیادہ۔؟“

”ہاں سب سے زیادہ۔“

”تمہارے اپنے وجود سے بھی زیادہ۔؟“

”ہاں۔“

”اور یہ بھی کہو کہ اس محبت کی میں واحد مالک ہوں۔ اس میں کوئی شریک

نہیں۔ جیسے۔ جیسے خدا کا کوئی شریک نہیں۔“

”ہاں کوئل! جس طرح میرا خدا ایک ہے۔ اسی طرح میری محبت کی حقدار

بھی ایک ہے۔ اور وہ تم ہو۔“

”تم جھوٹ کہتے ہو۔“ وہ زیر لب بولی۔

”کیا کہا۔؟ مجھے سمجھ نہیں آتی۔“ عدیل نے پوچھا۔

”تم جھوٹ کہتے ہو۔“ وہ بڑے زور سے چلائی۔ ”جھوٹ۔ سراسر جھوٹ۔“

”تم چار سال سے مجھے دھوکا دے رہے ہو۔ عدیل! تم جھوٹے ہو۔ فریبی ہو۔“

تھا کہ وہ کیا کرے۔؟

دماغ کے تمام تر جاگتے اجالوں کے باوجود وہ اندھیروں میں بھٹک رہی

تھی۔ اسے راستہ نہیں مل رہا تھا۔

اچانک اس کو اپنے ہونٹ ہلتے ہوئے محسوس ہوئے۔ شاید کوئی روشنی کی کرن

مل گئی تھی۔ شاید کوئی راہ سو جھانی دے گئی تھی۔

اس کی اپنی ہی آواز نے سکوت کو توڑا۔

”عدیل۔!“

وہ شاید سوچ چکا تھا۔ جواب میں بجز خاموشی کے اسے کچھ نہ ملا۔

”عدیل۔!“ اب اس نے قدرے زور سے پکارا۔

”ہوں۔“

”سو گئے ہو۔؟“

”نہیں۔ ذرا اذگھ گیا تھا۔“

”ایک بات پوچھوں۔؟“

”ہاں۔“

”تمہیں مجھ سے محبت ہے عدیل۔؟“

”ہاں مجھے تم سے محبت ہے کوئل۔!“

اس کی آواز میں بیداری سے زیادہ خواب کی سی کیفیت تھی۔

”کتنی۔؟“

”کتنی۔ کیا مطلب۔؟“

وہ رونے لگی۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“

عدیل گھبرا کر اٹھا اور جلدی سے روشنی کی۔

”مجھے۔ مجھے تو کچھ نہیں ہوا عدیل! تم ہی بدل گئے ہو۔“

کومل نے روتے روتے کہا۔

”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“

”یہ تم بھی جانتے ہو۔ مگر جان بوجھ کر انجان بن رہے ہو۔ تم جانتے تھے کہ ایک

نہ ایک دن مجھے پتہ چل جائے گا۔ مگر تم نے یہ نہ سوچا کہ میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچے

گی میرا دل ٹوٹ جائیگا۔ یہ تم نے کیا کیا عدیل۔؟ یہ تم نے کیا کیا۔؟“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”تمہیں کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے کومل۔!“

”سنی سنائی بات غلط ہو سکتی ہے عدیل! آنکھوں دیکھی نہیں۔ یقین نہ آئے

تو اپنے تکیے کے نیچے دیکھ لو۔“

عدیل نے جلدی سے تکیہ اٹھایا اور پھر۔ گویا اس کو سکتہ سا ہو گیا۔ اس کا

رنگ یوں زرد پڑ گیا جیسے کسی نے اس کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا تھا۔ اس کے

منہ سے صرف ”اوہ۔!“ نکل سکا۔

”اب بولو عدیل۔! کون بہک گیا۔؟ کون غلطی پر ہے۔؟ اب پھر کہو کہ میں

تمہیں دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہوں۔ اب کہو عدیل! کہ تمہاری محبت میں

کوئی شریک نہیں۔ اس محبت میں جسے تم خدا سے تشبیہ دیتے تھے۔ بولو عدیل!

”بولو۔“

عدیل کافی دیر تک چپ چاپ سر جھکاتے بیٹھا رہا۔ پھر ہولے سے بولا۔

”کومل! اب تم سو جاؤ۔ صبح میں تمہیں ساری بات سمجھا دوں گا۔“

”میں سو جاؤں۔؟“ وہ تلخی سے بولی۔

”کیسے سو جاؤں۔؟ تم ہی بتاؤ۔ میری محبت پر ڈاکہ پڑ جائے اور میں سو

جاؤں۔ لٹیرے میری خوشیاں لوٹ لیں۔ میری آرزوؤں کے نازک پھول روند

ڈالیں اور میں سو جاؤں۔؟“

”تو پھر اس وقت تم چاہتی کیا ہو۔؟“

عدیل کو غصہ آ گیا۔

”میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ تم نے یہ سب کیوں کیا۔؟“

”اور اگر میں کہوں کہ میرے پاس اس کا کوئی جواز نہیں تو کیا تم اعتبار

کر لو گی۔؟“

”تو۔ تو تمہارے پاس اس کا کوئی جواز نہیں۔؟“

”تمہاری قسم ہے مجھے۔۔۔“

”خبردار جو میری قسم اٹھاتی تم نے۔ قسم تو اس کی اٹھاتے ہیں عدیل! جو

بہت پیارا ہو۔ اس کی نہیں۔ جس کی محبت کا خون اپنے رومان کو پڑان چڑھنے

کے لیے بہایا جائے۔“

”تمہیں غلطی لگی ہے کومل! مجھے تم سے محبت ہے۔“

”ہاں۔ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ اور اسی محبت کے زیر اثر تم میری بہن

کے ساتھ عشق لڑاتے پھر رہے ہو۔ ہیں نا۔؟“
وہ جوش میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”وہ وقت یاد کرو عدیل! جب میں کہا کرتی تھی کہ ضد نہ کرو ہم ایک دوسرے کے دوست بن سکتے ہیں عمر بھر کے ساتھی نہیں۔ مگر تم اپنی ضد پراڑے رہے۔ اور میں بے صرف تمہارا دل رکھنے کو ہاں کر دی تھی۔ اپنی پسند اپنی آرزوؤں اپنے ارمانوں اور اپنی حسرتوں کو ترجیح کر تمہاری خاطر، صرف تمہاری خاطر ہاں کر دی تھی اور تم نے مجھے یہ صلہ دیا۔ میری قربانی کا اور پھر میری محبت کا، تم نے یہ بدل دیا ہے۔ کیوں۔؟ آخر کیوں۔؟ میرے اس سوال کا جواب دے دو۔ میں تم سے اور کچھ نہیں مانگتی۔ بولو۔ تم نے میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا۔؟“

عدیل سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔

”تم بولتے کیوں نہیں عدیل! لوگ تو قتل کرنے کے بعد بھی اقبالِ جرم کر لیتے ہیں۔ اور تم نے تو کوئی جرم نہیں کیا۔ صرف ایک دل ہی توڑا ہے نا۔ جو دنیا کے قانون کی رو سے کوئی جرم نہیں اور نہ ہی اس کی کوئی سزا ہے۔ پھر تم سچ کیوں نہیں بول دیتے۔ ڈر کس بات سے رہے ہو۔؟“

”کومل۔!“ عدیل نے طویل خاموشی کے بعد سر اٹھایا۔

”کومل! تم انسانی فطرت کو سمجھنے میں مہارت رکھتی ہونا۔ پھر یہ تم ضرور جانتی ہو گی کہ ہر انسان کے اندر ایک جذبہ ہوتا ہے جستجو کا۔ ناممکن کو ممکن کرنے کا۔ ان دیکھئے! انجانے خطرے مول لینے کا۔ اس جذبے کے تحت انسان پہاڑوں کو سر کرتا ہے۔ سمندر کی گہرائیوں میں غوطے لگاتا ہے۔ لقمہ و دق صحراؤں اور بھیاں

جنگلوں میں مارا مارا پھرتا ہے۔“

کومل کے آنسو ختم چکے تھے اور وہ چُپ چاپ عدیل کے چہرے کو تنکے جا رہی تھی۔

”کومل! میں نے اسی جذبے کے تحت تمہیں چاہا ہے۔ مجھے تم میں وہی عظمت اور بلندی نظر آئی تھی جو کسی کو ہپی کومونٹ ایورسٹ میں نظر آتی ہے۔ اور جو اسے اس چوٹی کو سر کرنے پر اکساتی ہے۔ وہی جذبہ مجھے تمہارے قریب لے آیا۔ اتنا قریب کہ مجھے یوں لگا جیسے میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ جیسے مجھے تم سے محبت ہے۔ کوئی جھوٹ بولے بغیر، کوئی گرہ رکھے بغیر اس نے دل کی ہر بات صاف صاف کہہ دی۔“

”لیکن میرا ناپختہ ذہن جسے محبت سمجھتا تھا وہ درحقیقت تمہاری عظمت اور گہرائی کی کشش تھی۔ اور پھر میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی۔ میں نے ماؤنٹ ایورسٹ کو اپنا مسکن بنانا چاہا۔ میں نے عام سیاحوں کی طرح جنگل سے گزر جانے کے بجائے وہیں عمر گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔“

کومل سینے پر ہاتھ باندھے دم بخود بیٹھی تھی۔ اس کی دھڑکنیں تھمی ہوئی تھیں اس کا سارا وجود ساکت تھا۔

”میں نے تم سے شادی کا ارادہ کر لیا۔ مگر مجھے اب احساس ہوا ہے کہ پہاڑ کی چوٹی سر کرنے کے لیے ہوتی ہے گھر بنانے کے لیے نہیں۔ جنگل خواہ کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو اس میں سے گزر جایا کرتے ہیں اس میں ڈیرے نہیں ڈال دیا کرتے۔“

عدیل نے جیسے اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہوئے مجرمانہ انداز میں سر جھکا یا۔

”میں اس بات کو مانتا ہوں کہ تم نے مجھے بہت سمجھایا مگر میں اپنی ضد پر اڑا رہا۔ جس کا خمیازہ اب ہم دونوں کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ مگر کوئل! میں مجبور ہوں۔ تم مجھ سے بہت بلند تھیں۔ اس بلندی کو زیر کرنے کی خاطر میں نے تمہاری زندگی برباد کر دی۔ مجھے معاف کر دو کوئل! مجھے معاف کر دو۔“ وہ اس طرح سینے پر بازو جکڑے بیٹھی تھی۔ جیسے ذرا بھی بندش ڈھیلی پڑی تو اس کا سینہ پھٹ جائے گا اور دل پاش پاش ہو کر بکھر جائے گا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہے جا رہے تھے۔

”عدیل! عدیل! کاش یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا۔ کاش! تم مجھ سے نہ ملے ہوتے۔ تم میری پرسکون زندگی میں آئے ہی کیوں تھے۔؟ اس میں ٹھیک پیدا کرنے۔؟ اسے طوفانوں سے آشنا کرنے۔؟ تو۔ تو تم فری سے محبت کرتے ہو۔؟“ وہ بے ربط سے فقرے بولے جا رہی تھی جیسے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔

”میں کچھ نہیں جانتا کوئل! میں اس وقت بھنور میں پھنس چکا ہوں۔ اور مجھے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کس چیز کا کیا مقام ہے۔ مجھے گرد و پیش کی ہر شے گردش میں نظر آتی ہے۔“

”مگر وہ تو تم سے محبت کرتی ہے نا۔؟“

عدیل خاموش رہا۔

”بولو عدیل! فری تم سے محبت کرتی ہے نا۔؟“ اس کے ہجے میں ایسی سنگینی تھی کہ عدیل کو جواب دیتے ہی بن پڑا۔

”ہاں۔ وہ کہتی تو یہی ہے۔“

”آج سے نہیں۔ یونیورسٹی کے زمانے سے۔ میں نا۔؟“

”ہاں۔“

”تو اب تم نے کیا فیصلہ کیا ہے۔؟“

”کس بات کا۔؟“

”اسی بات کا کہ شکست کس کی ہوئی ہے۔ میری یا فری کی۔؟“

”یہ ایک کوئی سوچ اس کے ذہن میں آئی۔“

”لیکن ٹھہرو۔ تم کچھ نہ کہنا۔ میں اس فیصلے کا حق کسی کو نہ دوں گی فیصلہ میرے ہاتھ رہے گا۔“

”میرے ہاتھ رہے گا۔“

اور وہ تکیے میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

کومل صبح جاگی تو عدیل کا بستر خالی تھا۔ فری اس کے بستر کے قریب
کرسی پر نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔
دن شاید کافی دیر کا چڑھا ہوا تھا۔ خاصی روشنی تھی۔
فری سے اس نے عدیل کے متعلق پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کر دیا۔
پھر اسے خود ہی خیال آیا کہ کل اس کی چھٹی ختم ہو گئی تھی۔ اور آج اسے دفتر
میں حاضری دینا تھی۔

صبح ہی صبح چلا گیا ہو گا کہ وقت پر دفتر پہنچ جائے۔ اس نے سوچا۔
"فری! کومل نے اس کی طرف رخ پھیرا۔

رات کے چند گھنٹے سو لینے کے باوجود اس کے اندر کا طوفان ذرا پرسکون
نہ ہوا تھا۔ اور وہ ابھی ابھی ہر بات، ہر معاملہ صاف کر لینا چاہتی تھی۔ پھر شاید

کچھ سکون آجائے۔

"میں تم سے چند باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"
"اچھا۔ میں ابھی کافی بنا کر لاتی ہوں۔ پھر بیٹھ کر ساتھ باتیں کریں گی۔"
وہ اٹھ کر باورچی خانے کی طرف چل پڑی۔
"رک جاؤ فری! میں جو باتیں کرنے والی ہوں ان کی تلخی مٹانے کے لیے
تم کوئی میٹھی چیز تجویز کرو۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔"
شاید وہ کچھ سمجھ گئی تھی۔ مگر ٹالنے کی کوشش کر رہی تھی۔
"اور ہاں باجی! کیا رات کو آپ دونوں کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ آپ کے کمرے
سے بڑی تیز تیز باتوں کی آواز آرہی تھی۔"
"دیکھو فری! میاں بیوی میں چند ایسی باتیں ہوتی ہیں جو وہ کسی کو نہیں
بتاتے۔ اس لیے ہر بات کی ٹوہ لگانا مناسب نہیں لگتا۔"
اپنی فہم میں کومل نے کوئی اپنا انتقام لے لیا۔
"فری بیٹھ جاؤ۔"

قدرے توقف بعد کومل پھر بولی۔

"میں تم سے صرف ایک سوال پوچھوں گی۔ سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ اور
ذہن میں یہ ضرور رکھنا کہ ایک بھی جھوٹا لفظ بگڑے ہوئے حالات کو تباہی کے
اور زیادہ نزدیک لاکھڑا کرے گا۔"
"پوچھیے۔" فری کی آواز کانپ رہی تھی۔

”فری تم کو مل کی ہمت جواب دے رہی تھی مگر اس نے اپنی پوری قوت مجتمع کرتے ہوئے الفاظ ہونٹوں سے نکال ہی دیئے۔

”تم عدیل سے محبت کرتی ہو۔؟“

اس کو یوں محسوس ہوا گویا اس کے سینے سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا۔ جیسے اس نے زندگی کے تمام فرائض ادا کر دیئے تھے۔

اور فری کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ چوری کرتے کرتے عین موقع پر پکڑی گئی تھی۔ الفاظ زہر کے قطرے بن کر اس کے کانوں میں ٹپکے اور سارے جسم میں آگ سی لگا گئے۔

رومیں رومیں سے چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔ ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جھلملانے لگے۔

یکدم اس کا جی چاہا کہ وہ اٹھ کر وہاں سے بھاگ جائے۔ مگر اس میں تو انگلی ہلانے کی تاب تک نہ تھی۔ بھاگتی کیسے۔؟

”جواب دو فری۔! اور اگر سوچنے کے لیے وقت درکار ہے تو میں تمہیں وہ بھی دے سکتی ہوں۔“

”یہ آپ سے کس نے کہا ہے باجی۔؟“

اس کے الفاظ حلق میں اٹکے جاتے تھے۔

”اس تصویر نے جو تم نے عدیل کے ساتھ کھینچوائی تھی۔ ان پتھروں نے بتایا ہے جن پر بیٹھ کر عدیل کا سراپا اپنی آغوش میں رکھ کر تم نے اس پر یہ راز

کھولا تھا کہ تم یونیورسٹی کے زمانے سے اس پر جان دیتی ہو۔“

اک مجروح سی مسکراہٹ کو مل کے لبوں پر بکھر گئی۔

”میرے گواہوں کی صداقت پر شک ہے تمہیں۔؟“

فریحہ سر جھکاتے خاموش بیٹھی رہی۔

”میں تمہارے جواب کی منتظر ہوں فری۔!“

اور پھر یکایک فریحہ کا خون کھول اٹھا۔

وہ بچھڑ گئی۔ طوفانی لہر کی طرح۔! شکاریوں کے زرخے میں گھری ہوئی

شیرنی کی طرح۔!!

”باجی! اگر تم سب کچھ جانتی ہو تو پھر مجھ سے پوچھنے کا حاصل۔؟“

”میں نے کہا تھا نا کہ اس سے نہ پوچھو۔“ کو مل کے دل سے آواز آئی۔ اس

میں محبت نے وہ بے پناہ قوت بھردی ہے کہ اب وہ دنیا کی ہر طاقت سے

ٹکڑے کر سکتی ہے۔ اور تم۔ تم تو انتہائی کمزور ہو۔ نہ ہونے کے برابر۔ کہ تمہارے

پاس کچھ نہیں۔ عدیل فری کا ہے اور تم اکیلی ہو۔“

”باجی۔! فریحہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

”باجی! تم مجھے اس وجہ سے مجرم گردانتی ہو کہ میں نے تمہارے شوہر سے

محبت کی ہے۔ لیکن انصاف کی رو سے تم مجھ سے بھی بڑی مجرم ہو۔ تم نے چار

سال پہلے مجھ سے میرا عدیل چھین لیا تھا۔ کیوں۔؟“

وہ آندھی کی طرح بکھر گئی اور گرد و غبار پھیلنے لگا۔

”تم جانتی تھیں کہ میں اس سے پیار کرتی ہوں۔ مگر تم نے میری محبت کو

لوٹ لیا۔ اپنا گھر آباد کرنے کے لیے۔!“

یہ ایک اس کی آواز بھرانے لگی۔

”میں مانتی ہوں باجی۔ کہ تم مجھ سے بہتر ہو۔ ہر لحاظ سے۔ مگر تم نے اپنی برتری کا ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اور عدیل۔ جو تمہارا صرف دوست بن کر آیا تھا تم نے اسے اپنے دل میں بسالیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں اس کی پرستش کرتی ہوں۔“

اس کے رخساروں پر آنسوؤں کی لڑیاں بہہ نکلیں۔

”باجی! کاش تمہیں ویسی ایک رات گزارنے کو ملی ہوتی جیسی میں گزشتہ چار سال سے گزار رہی ہوں۔ تب تمہیں اندازہ ہوتا کہ شکست خوردہ محبت کی آگ کس طرح جلاتی ہے۔ اس کا گھاؤ کتنا کرب انگیز ہوتا ہے۔“

اک زہر بھری نگاہ سے اس نے گھور کر کوئل کو دیکھا۔

”کاش! میں نے تم سے عدیل کا تعارف نہ کرایا ہوتا۔ کاش! میری محبت پر تمہارا سایہ نہ پڑا ہوتا۔ تب آج میری زندگی کتنی مختلف ہوتی۔ کس قدر سکھی۔! وہ آنسو بہاتے ہوئے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

کوئل چپ چاپ بیٹھی تھی۔ دم بخود۔ طوفان گزر جانے کے بعد والا سکوت ہر طرف طاری تھا۔

پندرہ منٹ بعد وہ پھر کمرے میں داخل ہوئی۔ قدموں کی چاپ پر کوئل نے نگاہیں اٹھائیں۔

وہ اپنا اٹیچی کیس اٹھائے کھڑی تھی۔

”میں واپس جا رہی ہوں باجی! تمہیں تمہارا عدیل مبارک ہو۔“

مگر کوئل نے گویا سنا ہی نہیں۔ اس کے کان جیسے جس سماعت سے بے بہرہ تھے۔ بس خالی خالی نگاہوں سے اسے دکھیتی رہی۔

اب کیا ہوگا۔؟ وہ سوچے جا رہی تھی۔

اب کیا ہوگا۔؟؟

یہی سوال بار بار اس کے ذہن میں گونج رہا تھا۔

اب کیا ہوگا۔؟؟؟

اس نے سوچنا چاہا۔ مگر یہ قوت بھی ساتھ چھوڑ چکی تھی۔

اس کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ایک بے کنار بے پایاں خلا میں تیر رہی تھی۔ جہاں نہ اندھیرا تھا نہ روشنی۔ کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔

بس خلا ہی خلا تھا۔

جدھر نظر اٹھاتی۔

خلا ہی خلا۔!

اور وہی سوال بھڑکے کی طرح اس کے ذہن پر مسلسل ضربیں لگائے جا رہا تھا۔

اب کیا ہوگا۔؟

اب کیا ہوگا۔؟؟

اب کیا ہوگا۔؟؟؟

اتنے دن ہسپتال رہی تھی۔ اتنا بڑا صدمہ اس پر سے گزر گیا تھا۔ اور وہ۔
 اس کی ماں تھیں۔ ان کی ماتا کا تقاضا کچھ اور تھا۔!!
 اور تب۔ آپ ہی آپ ان کے بازو پھیل گئے۔
 ”ارے! تم تو مجھ سے ملی بھی نہیں۔ کتنے مہینوں بعد میں نے تمہیں دیکھا
 ہے۔ بہت نڈر ہو گئی ہو۔ بہت کمزور ہو رہی ہو۔“
 کتنی ہی دیر سینے کے ساتھ اسے بچنے رہنے کے بعد علیحدہ کر کے انہوں نے
 اسے اپنے پاس بٹھالیا۔

”اب طبیعت کیسی ہے تمہاری۔؟“

”جی اچھی ہوں۔“

آنکھوں میں پھیلنے والی نمی کو اس نے امی سے چھپانے کی کوشش کی۔
 ”کوئل بیٹی! ایک بات بتاؤ۔؟“

امی نے یکایک سنجیدہ اور قدرے پریشان سا ہوتے ہوئے اس کی طرف
 بغور دیکھا۔

”فری کو کیا ہوا ہے۔؟ جب سے مری سے آئی ہے اپنے کمرے میں ہی
 گھسی ہے۔ کینز بتا رہی تھی کہ رو بھی رہی تھی۔ بات کیا ہے آخر۔؟“
 امی بے حد متفکر تھیں۔

”میں نے خود اس سے پوچھا ہے۔ مگر مجھے تو کچھ بھی نہیں بتاتی۔“

”مجھے بھی معلوم نہیں امی۔! مٹھریے میں خود جا کر اس سے پوچھتی ہوں۔“
 کوئل اٹھ کر فری کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ دروازہ بند تھا۔ کھولنے کی

امی اس کی غیر متوقع آمد پر حیران رہ گئیں۔
 ”کوئل تم۔؟“

ان کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ گیا۔

”بغیر اطلاع دیئے ہی چلی آئی ہو۔؟“

”یونہی ذرا آپ کے بغیر اداس ہو گئی تھی۔“

”اور عدیل کہاں ہے۔؟“

”اسے کچھ کام تھا۔ اس لیے اکیلی ہی آئی ہوں۔“

”تو بیٹی! کل بہن کے ساتھ ہی آجائیں۔“

پھر اچانک امی کو خیال آیا۔ وہ آتے ہی کھڑے ہی کھڑے اس سے سوال
 جواب کرنے لگ گئی تھیں۔ نہ اس کا حال پوچھا تھا۔ نہ خیریت۔

کوشش کی مگر اندر سے شاید چٹپنی لگی تھی۔

دستک دینے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ لیکن جانے کیا ہوا۔؟ ایک دم یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کا سامنا نہ کر سکے گی۔
تب وہ چپ چاپ وہیں سے واپس مڑ آئی۔

”بل آئی ہو۔؟“

امی نے کچھ جاننے کے لیے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔

”وہ۔ وہ سو رہی ہے۔“

کول پھرماں کے پاس بیٹھ گئی۔

”کینز۔ کول آئی ہے۔ کھانے وغیرہ کا بندوبست کرو۔“

”منہیں امی! کھانا منہیں کھاؤں گی۔ ڈائننگ کار سے کھالیا تھا۔“

”پھر۔؟ چائے۔؟“

”ہاں۔ چائے ضرور پیوں گی۔ کینز کے ہاتھ کی چائے اکثر یاد آتی رہتی تھی۔“

آنکھوں میں بار بار نمی گھلی جا رہی تھی۔ بہت کوشش کے باوجود قابو

پایا ہی نہیں جا رہا تھا۔

”شاید اس کی چائے ہی مجھے واپس گھسیٹ لائی ہے۔“

”لو۔ امی منس پڑیں۔ اسی لمحے کینز اندر آئی۔ وہ اس سے مخاطب ہوئیں۔“

”دیکھو تمہاری کول بی بی تمہارے ہاتھ کی چائے پینے آئی ہے۔“

”صدقے واری جاؤں۔ سو سو بار چائے پلاؤں۔“

وہ حسب معمول کچھ نہ کچھ بولتی چلی آئی۔ پھر کول کے قدموں میں بیٹھ کر

اس کا حال چال پوچھنے لگی۔

”کینز! باتیں پھر کرینا۔ پہلے اسے چائے تو پلاؤ۔“

”چائے بھی بناتی ہوں۔ ابھی دو منٹ ہیں۔ لیکن میری کول بی بی پہلے

غسل وغیرہ منہیں کریں گی۔؟ دیکھیں تو لباس کس قدر ملگجسا ہو رہا ہے۔ اور

بال بھی کچھ اُلجھے بکھرے سے ہیں۔“

”ارے! ہاں تو۔“

امی نے اب تک اس کے سر اپا کو شاید غور سے دیکھا ہی نہ تھا۔ ان کی

بیٹی اتنے عرصہ بعد ملی تھی۔ مانتا بس اسی میں کھوئی رہی تھی۔

کچھ اور دیکھنے یا محسوس کرنے کا ہوش ہی نہ رہا تھا۔

”یہ تم نے اپنی حالت کیا بنائی ہوئی ہے۔؟“

”گرمی کا سفر حالت کو یونہی خستہ خراب کر دیتا ہے۔“

”تو واقعی پھر پہلے نہالو۔“

کینز نے اس کا اٹیچی کھول کر اپنی مرضی سے جلد جلد اس کے کپڑے نکال

دیئے۔

”اوپر آپ کے کمرے میں رکھ آؤں۔؟“

”نہیں۔ ابھی اوپر جانے کی ہمت نہیں۔ امی کے غسل خانے میں لگا دو۔“

نہا کر صاف ستھرے کپڑے پہن کر وہ باہر نکلی تو کینز نے چائے بنا کر لاکھی

ساتھ اس کی پسند کے مطابق گرم گرم پکوڑے تھے۔

چائے پیتے ہوئے امی نے پھر فریج کا ذکر چھڑ دیا۔

”عدیل سے شادی کرنے کی۔“
 ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو کومل۔؟“
 ان کی آواز قدرے لرزی۔
 ”ہاں امی! عدیل مجھ سے نہیں فری سے محبت کرتا ہے۔“
 ”کومل۔! ماں پریشانی بھرے لہجے میں چیخ سی پڑیں۔“
 ”فری اسی وجہ سے واپس آگئی ہے امی۔! میں نے اس سے پوچھ گچھ
 کی تھی تو وہ ناراض ہو گئی۔“
 ”اور عدیل۔؟“
 ”امی! میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔“
 ”کومل ماں کی سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی۔“
 ”کہ اب واپس کبھی نہیں جاؤں گی۔“
 ”واپس نہیں جاؤ گی۔؟ یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔؟“
 ”امی ہڑبڑاسی گئیں۔“
 ”نہیں نہیں میری بچی! ایسے الفاظ منہ سے مت نکالو۔ اب تمہارا ایک ہی
 گھر ہے۔ ایک ہی مقام ہے۔ وہیں جہاں عدیل ہے۔“
 ”امی کی آواز لرز رہی تھی۔ اور وہ کومل کے چہرے میں کچھ تلاش کرنے کی
 کوشش میں بڑے غور سے اسے دیکھ رہی تھیں۔“
 ”نہیں امی۔! کومل نے ماں کی ان گہری نگاہوں سے نظر ہٹاتے ہوئے
 دھیرے سے کہا۔“

”اس کو آخر ہوا کیا تھا۔؟ تمہارے پاس تو دو مہینے کے لیے گئی تھی۔ مگر
 صرف اٹھائیس دن رہ کر۔“
 ”پتہ نہیں۔ کل بس یکا یک کہنے لگی کہ واپس جانا چاہتی ہوں۔ میں نے۔۔
 اور عدیل نے بہتیارو کا۔ مگر مافی ہی نہیں۔“
 ”بیٹی۔! امی نے بڑے غور سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”یوں لگتا ہے تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔“
 ”ماں کی نکتہ بین نگاہ نے جیسے بہت کچھ جان لیا تھا۔ وہ سب بھی جو وہ
 بتانا نہیں چاہتی تھی۔“
 ”مجھے بتاؤ تو سہی بات کیا ہے۔؟“
 اتنی دیر سے وہ سب کچھ سینے کے اندر سمیٹے اور چھپاتے بیٹھی تھی۔ اب مزید
 صبر نہ ہو سکا۔ دل یکدم بھر آیا۔
 ”دے دے کر ایک ماں کی ہستی تو رہ گئی تھی۔ جسے وہ اپنے غم میں شریک کر سکتی
 تھی۔ یا کم از کم جسے وہ اپنے غم سے آگاہ کر سکتی تھی۔“
 ”آنکھوں میں اک سیلاب سا آگیا۔ جو اس کے ضبط و تحمل کو خس و خاشاک کی
 طرح ساتھ بہا لے گیا۔“
 ”امی! میں نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔“
 ”غلطی۔؟“ امی چونک پڑیں۔
 ”کون سی غلطی۔؟“
 ان کے ہاتھ کپکپاتے۔ انہوں نے چائے کی پیالی جلدی سے نیچے رکھ دی۔

”میں نے اس سلسلے میں بہت سوچا ہے۔ اور آخر میں اسی فیصلے پر پہنچی ہوں کہ عدیل سے طلاق لے لوں۔“

”طلاق؟ کوئل! ہوش میں آؤ۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔؟“
 اُمّی کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اُمّی کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اُمّی کا لہجہ مرتعش تھا۔ جیسے ان کی ساری ہستی طوفان کی زد میں آئی ہوئی تھی۔
 ”تم جانتی ہو بیٹی! طلاق کس کا نام ہے۔؟ عورت کی ذلت اور رسوائی کا نام طلاق ہے۔ عورت کی باعزت زندگی کی موت کا نام طلاق ہے۔! انہیں میری سچی! خدا نہ کرے تمہیں طلاق لینے کی نوبت آئے۔“

ماں نے ڈولتے لہجے میں اُسے سمجھایا۔
 ”اُمّی! میرا فیصلہ بدلنے کی کوشش نہ کیجیے پلیز! یہ میرا اٹل اور آخری فیصلہ ہے۔“

اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔
 ”آج اباجی آئیں تو ان کو ساری بات سمجھا دیجیے گا۔ میں شاید ان کے سامنے بات نہ کر سکوں۔“

”ایک مرتبہ پھر سوچ لو کوئل! مردوں سے ایسی غلطیاں ہو ہی چاہا کرتی ہیں۔ مگر ہم عورتوں کا دل بہت بڑا ہوتا ہے۔ اسے معاف کر دو میری سچی! اس کی طرف سے میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔“

اور اُمّی نے سچ مچ اُس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔
 ”اُمّی! مجھے مجبور نہ کریں۔“

کوئل کے رخساروں پر آنسو بہے جا رہے تھے۔ اُمّی کے جڑے ہوئے دونوں ہاتھ پکڑ کر اس نے اپنے سینے سے لگا لیے۔

پھر کپکپاتے ہونٹوں کو دانتوں میں دبا کر سمجھاتے ہوئے بولی۔
 ”میں ہر دکھ سہہ سکتی ہوں! لیکن اپنے شوہر کی محبت میں کسی کو حصہ دار نہیں بنا سکتی۔ کسی کو بھی نہیں۔ آپ بھی عورت ہیں۔ آپ بتائیے اُمّی! اگر آپ میری جگہ ہوتیں تو کیا کرتیں۔؟“

”اے معاف کر دو میری بیٹی! تمہاری بڑائی اسی میں ہے۔ تب اُمّی کو جانے کیا ہوا۔؟ بڑے جوش سے یکدم اٹھ کھڑی ہوئیں۔
 ”ٹھہرو۔ میں ذرا فری سے دو دو باتیں تو کر آؤں۔“
 ”نہیں اُمّی۔!“

کوئل نے ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔
 ”اے کچھ نہ کہیے۔ میں تو یہ سوچ کر آئی ہوں کہ عدیل کے ساتھ اس کی شادی کی کوشش کروں۔!“

”یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کوئل! تم کیا سمجھتی ہو کہ میں ایک بیٹی کی آرزوؤں کی راکھ سے دوسری کی مانگ کا سینہ در بناؤں گی۔؟ میرے لیے تم دونوں ایک جیسی ہو۔ بلکہ شاید تم مجھے زیادہ عزیز ہو۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی کبھی نہیں ہونے دوں گی۔ خدا تمہیں تمہارے گھر میں آباد اور خوش رکھے۔ فری کو اور بہت سے لڑکے مل سکتے ہیں۔“

”مگر اُمّی! وہ اور عدیل ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔“

کومل نے ماں کو حقیقت کا احساس دلانے کی کوشش کی۔

”یہ پیارا محبت اور عشق کیا بکواس ہے۔؟“

امی نے غصے میں کہا۔

”میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ ایک بوی کو صرف اپنے شوہر سے پیار ہونا چاہیے خواہ وہ گنوار ہو، اُجد ہو یا کوئی شہزادہ۔ بھلا کنواری لڑکیوں کو کیا حق ہے کہ وہ کسی غیر مرد کے ساتھ محبت کا خیال بھی دل میں لائیں۔“

”امی! آپ کہتی ہیں۔ محبت کیا ہے۔؟ میں کہتی ہوں محبت کیا نہیں ہوتے امی! اگر اس کے فقدان کی وجہ سے میں اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر رہی ہوں تو کیا وہ دونوں اس کے وجود کی بنا پر ایک دوسرے کے نہیں ہو سکتے؟“

”میں کچھ نہیں سمجھتی اور نہ سمجھنا چاہتی ہوں۔“

امی نے اُجھٹتے ہوئے کہا۔

”میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ فری خواہ عمر بھر کنواری بیٹھی رہے مگر عدیل کے ساتھ اس کی شادی نہیں ہو سکتی۔“

”امی! آپ جذباتی ہو رہی ہیں۔ اور میں نے یہ فیصلہ ٹھنڈے دل سے سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ آپ شاید یہ نہیں جانتیں کہ اس فیصلے پر پہنچنے کے لیے مجھے کن جہنموں سے گزرنا پڑا ہے۔“

وہ بڑے کرب سے بولے جا رہی تھی اور امی اسے بڑے دکھ سے ٹکے جا رہی تھیں۔

”میرے دل نے کیا کیا برداشت نہیں کیا۔ میں نے انگوں کے کون کون سے

محل مسما رہیں کیے۔ میں یہ سب آپ کو کیوں بتاؤں۔؟ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ اس دنیا میں رہنے کے لیے ہمیں حقیقت پسندی کو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے ہمیشہ وہی کچھ نہیں ہوتا جو ہم چاہتے ہیں۔“

وہ غم سے کراہ پڑی۔

”اور یہی انسان کا سب سے بڑا المیہ ہے۔“

”میری بچی! کاش! تم نے یہ شادی نہ کی ہوتی۔“

اک دکھ بھری آہ کے ساتھ امی صرف اتنا ہی کہہ سکیں۔

”ہاں امی! میں خود کو بہت عقلمند سمجھتی تھی۔ لیکن زندگی کا سا تھی چلنے

میں میں نے بڑی غلطی کی ہے۔“

یکدم وہ خاموش ہو گئی۔ پھر بہتے ہوئے آنسوؤں کو خشک کرتے ہوئے

ہولے سے بولی۔

”لیکن نہیں۔ میں نے غلطی نہیں کی امی۔ مجھے اپنی پسند پر ناز ہے۔ عدیل

کسی بھی لحاظ میں کسی اچھے سے اچھے انسان سے بھی اچھا ہے۔ مگر۔ یہ میری

ٹرکبڈی ہے کہ اسے مجھ سے محبت نہیں۔ اسے مجھ سے محبت نہیں۔ اسے۔

اسے۔“

وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپاتے ہوئے امی کی آغوش میں گر پڑی۔

اداس تھا؟

سینے سے لگے اس کے — کو سہلاتے ہوئے وہ پھر لوچھنے لگے۔
 ”اکیلی آتی ہو۔؟ عدیل کیوں نہیں آیا۔؟“
 کومل پہلے قدرے سٹپٹائی پھر جلدی سے سنبھل کر بولی۔
 ”چھٹی نہیں تھی۔“

”ہاں ہاں۔ ہماری باری آئی تو چھٹی نہیں تھی۔ اور وہ جو مری میں سیریں
 کیں۔“

اتنی یکدم کھنکارنے لگیں۔ وہ عدیل کے ذکر سے بچنا چاہتی تھی اور آبا
 معصومیت سے اسی کا پوچھے جارہے تھے۔

یوں اس نے پھر پریشان ہو جانا تھا۔ اور وہ پہلے ہی کئی گھنٹے روتی
 تھی۔ اب تو تھک بھی چکی ہوگی۔!

”تمہاری کھانسی ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی نا۔؟“
 کومل کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھتے ہوئے وہ اتنی سے بولے۔ پھر کومل کی
 طرف دیکھ کر مسکرائے۔

”دیکھ لو کومل! تمہاری اتنی مجھے اس طرح ستاتی ہیں۔ انہیں کچھ
 سمجھاؤ۔ اپنی صحت کا خیال ہی نہیں رکھتیں۔“

”اباجی! میں اب آگئی ہوں نا۔ اب آپ بالکل کوئی فکر نہ کریں۔ سب کچھ
 سنبھال لوں گی۔ اتنی کو بھی اور آپ کو بھی۔ آپ بھی شاید محنت زیادہ کرتے
 ہیں اور آرام کم۔ بہت کمزور ہو رہے ہیں۔“

شام کو آبا گھر آئے۔ کومل کو دیکھ کر وہ اتنی سے بھی کچھ زیادہ ہی حیران ہوئے
 لیکن اتنی کی طرح حیرت میں ڈوب کر انہوں نے سوال پر سوال نہیں کرنا شروع
 کر دیتے۔

اس کے برعکس وہ دونوں بازو پھیلا کر اس کی طرف بڑھ آئے۔ کومل سے
 انہیں بہت زیادہ پیار تھا۔ اور وہ بھی کسی معصوم بچے کی طرح ان کی باہوں میں
 سمٹ آتی۔

”اباجی! میں آپ کے بغیر بڑی اداس تھی۔“
 آبا کے لمس میں جانے کیا تھا۔ اس کے آنسو بڑی روانی اور تیزی سے
 بہہ نکلے۔

”تو بیٹے! تو میرے پاس پہلے کیوں نہ آگئی۔ خود تیرا آبا بھی تیرے بغیر بڑا

”بھئی ہم تو۔۔۔“ پھر کیا مک انہیں جیسے کچھ یاد آگیا۔

”ارے! وہ فری کہاں ہے۔؟“

”اپنے کمرے میں۔“

امی نے نگاہیں جھکا کر مختصر سا جواب دیا۔

”اس کی حالت بہتر ہوئی یا نہیں۔ جانے اسے۔۔۔“

نجانے وہ کیا کہنے والے تھے۔ امی درمیان میں ہی بول پڑیں۔

”میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتی تھی۔“

”اباجی! میں آپ کے لیے چائے بنا لاؤں۔؟“

کومل جلدی سے اٹھ پڑی۔ امی شاید اسی کے متعلق بات کرنے والی تھیں۔

”نہیں بیٹی! تم آج ہی آئی ہو۔ کینز سے کہو۔“

”کوئی بات نہیں۔“

امی بھی شاید یہی چاہتی تھیں۔

”آپ کو ہمیشہ اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے اچھی لگا کرتی تھی۔“

”ہاں! آبا بڑے پیار سے اسے دیکھتے ہوئے ہنس پڑے۔“

”لگا تو کرتی تھی۔ مگر اب کیا کریں۔؟“

پھر عجب حسرت بھرے انداز میں بولے۔

”اتنی مشکل سے کینز کے ہاتھ کی عادت ڈالی ہے۔ اپنی عادت تو نہ خراب

کروں۔ کل پرسوں یہ پھر چلی جائے گی۔“

”ایسی باتیں نہ کیجیے اباجی! میں اب ہمیشہ آپ کے پاس۔۔۔“

”اچھا اچھا۔ تم جاؤ چائے بناؤ۔“

امی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے ہاتھ سے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ جلدی

سے باورچی خانے میں چلی گئی۔

کینز کھانا وغیرہ پکا رہی تھی۔ کومل چائے بنانے لگی۔ باوجود اس کے کہ

کینز نے کئی بار منع کیا۔

چند دن کے لیے آئی تھی۔ کام کرنے لگ جاتی۔ اسے اچھا نہ لگا۔ بھلا وہ

کس لیے تھی۔

مگر کومل نہ مانی۔ آبا کے لیے اس نے چائے خود ہی بنائی۔

ساتھ ساتھ دونوں باتیں کرتی رہیں۔ ادھر ادھر کی۔ رشتہ داروں کی۔

پڑوسیوں کی۔ ملنے جلنے والوں کی۔

غرض بہت ساری باتیں، بہت نئی تازہ خبریں کینز نے اسے سنا ڈالیں

چائے تیار ہو بھی گئی۔ تب بھی اس نے بہت سا وقت ادھر ادھر میں گزار دیا۔

کہ امی جس طرح، جس انداز میں آبا سے بات کرنا چاہتی تھیں۔ اطمینان

سے کر لیں۔ پھر کافی وقت لگا کر جب وہ چائے کی ٹرائی لیے اندر گئی تو امی اور

آبا دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ بالکل گم سم۔!

اسے دیکھتے ہی آبا نے اسے بلا کر اپنے پاس بٹھالیا۔ وہ ٹرائی وہیں لے

آئی۔ چائے پیالیوں میں انڈیلنے لگی تو آبا نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

”کیوں بیٹی! یہ سب سچ ہے۔؟“

کومل کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

عجب سا ارتعاش ان کی آواز میں تھا اور کومل کے سر پر رکھا ہاتھ بھی ایسے لرز رہا تھا جیسے ان کی ہستی میں بڑے زور کا زلزلہ آیا ہوا تھا۔
جواب میں کومل کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ ان کا لہجہ، ان کا انداز ایسا تھا کہ خود اس کا دل بھر آیا۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کی نہیں بلکہ آبا کی زندگی طوفانوں سے دوچار ہو گئی تھی۔ بڑے ہولناک قسم کے طوفانوں سے!۔
”تو تم اپنے فیصلے پر قائم ہو۔؟“

ان کی مرتعش آواز نے پھر سکوت ہی نہیں بلکہ اسے بھی جیسے توڑ ڈالا۔
”جی۔ جی۔؟“ بکھرے بکھرے سے انداز میں اس نے مختصر سا جواب دیا۔
”میری بچی! ان کی آواز میں بسا رنج و غم، درد و کرب کہہ رہا تھا کہ وہ نسو کی زبان میں بات کر رہے تھے۔ مگر ان کی آنکھیں خشک تھیں۔“
”ایک باپ کے لیے سب سے کھٹن وقت وہ ہوتا ہے جب اس کی شادی آباد بیٹی والیں اچھانے۔ والدین برباد ہو جاتے ہیں اس وقت بیٹی۔ لیکن مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے۔ تمہارا فیصلہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ اس لیے میں تمہارے فیصلے کی بالکل مخالفت نہیں کروں گا البتہ۔“

وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش سے ہو گئے۔ کومل کا جی دھک دھک کرنے لگا۔ کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے وہ دھیرے سے بولے۔

”جہاں تک فری کے بیاہ کا تعلق ہے میں تمہاری ماں کا ہم خیال ہوں۔ اور جہاں تک میں اسے جانتا ہوں وہ لڑکی اتنی کم ظرف اور خود غرض نہیں کہ ان حالات میں عدیل کے ساتھ شادی کا خیال بھی دل میں لاتے۔ خواہ اسے

اس سے کتنی ہی محبت کیوں نہ ہو۔!“
ان کے ہاتھوں کی لرزش اور لہجے کا ارتعاش اتنا زیادہ ہو گیا کہ کومل کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے ان کی حیات میں آئے ہوئے طوفانوں میں خود وہ بھی بہی چلی جا رہی تھی۔

سبکیوں سے اس کا سارا وجود کانپ اٹھا۔ اس نے آبا کے سینے میں چہرہ گھس لیا۔ شاید یہ پناہ گاہ۔ ان طوفانوں سے اسے بچالے۔!!
”اچھا میری بچی! خدا تمہارا نگہبان ہو۔ تم نے اپنی زندگی کو ایک بہت بڑے امتحان میں ڈال لیا ہے۔ خدا تمہیں صبر اور حوصلہ دے۔!“
وہ اس کا سر سہلاتے لگے۔ اس کی پیٹھ تھپکنے لگے۔
اور جیسے۔ مزید کچھ بھی کہنے کو ان کے پاس الفاظ نہ تھے۔ دُور۔ بہت دُور۔ کھڑکی سے پار۔ اندھیروں میں ان کی نگاہیں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔
کوئی روشنی کی کرن۔! کوئی جگمگ جگمگ کرتا ہوا ننھا سا جگنو۔! وہ راستہ تو پاسکیں۔ وہ راستہ تو پاسکیں۔

ملتا ہے اور ذہنوں کو آسودگی :-!

اور۔ کومل کے اصولوں پر چل کر واقعی اس نے یہی سب کچھ پایا تھا۔
صبح دفتر جاتا اور رات گئے واپس آتا۔ اتنا تھکا ہوتا کہ لیٹتے ہی نیند اسے
آدب جیتی۔ ان دنوں میں اسے کچھ سوچنے سمجھنے، کوئی پچھلی بات یاد کرنے کا موقع
ہی نہ ملا۔ بلکہ کام میں وہ خود کو بھی بھولا ہوا تھا۔

اور آج۔ وہ پچھلے بیس دن کے کاموں سے فارغ ہوا تھا۔ پورے چھ دن
حد درجہ مصروفیت میں گزار کر۔

ذہنی طور پر وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ دفتر سے نکلتے
ہی کچھ شاپنگ کی اور پھر مری کی بس جا پکڑی۔
آج کل مری میں ہی اس کا گھر تھا۔ اس کا گھر۔ جس میں سکون تھا۔ جس
میں اطمینان تھا۔

دروازے پر دستک دیتے ہوئے وہ سجانے کیا کیا سوچ رہا تھا۔ ایک بڑا سا
پکیٹ اس کی بغل میں دبا تھا۔ ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔
اس میں کومل اور فری کے لیے ساڑھیاں تھیں۔
”پورے بیس سوال کر کے اکیسویں پر بتاؤں گا کہ تم دونوں کے لیے
کیا کیا لایا ہوں۔؟“

وہ خیالوں ہی خیالوں میں مسکرا رہا تھا۔ کھٹاک سے دروازہ کھلا۔ ڈھیر
سارنی مسکراہٹوں کے ساتھ اس نے نگاہیں اٹھائیں۔
”ارے۔! جلدی سے اس نے اپنے لب بھینچ لیے۔

چھ دن ہو گئے تھے اسے پنڈی آتے ہوئے۔ یہ دن بہت مصروفیات
میں گزرے تھے۔ پچھلے مہینے کے پورے بیس دن وہ چھٹی پر رہا تھا۔ دفتر کا
سارے کا سارا کام پڑا ہوا تھا۔

بے شک محکمے میں وہ خاصا بڑا افسر تھا مگر دوسروں کی طرح اس نے
ماتحتوں پر رعب ڈال کر اور انہیں سے سارے کام کر کے ہمیشہ تنخواہ نہیں
وصول کی تھی۔ بلکہ جتنی تنخواہ تھی اس سے ہمیشہ کچھ بڑھ کر ہی کام کیا۔

کہ یہ اس کی کومل کی تمنا تھی۔ اس نے اس کا آئیڈیل بننا تھا۔ اس نے اس
کی خواہشات اور خیالات و توقعات پر پورا اترنا تھا۔ اس نے اپنی محبت پانا تھی۔
تب۔ اس کے اصولوں کے مطابق اس نے اپنے آپ کو ڈھال لیا تھا۔
محنت کی کمائی، جائز آمدن ہمیشہ خیر و برکت کا باعث ہوتی ہے۔ دلوں کو سکون

سہی ہوئی اس کے بازوؤں میں کتنی ہی دیر پڑی رہا کرتی تھی۔
یہ اس کی عادت تھی کہ ذرا سی بلند آواز سے بھی وہ ڈر جایا کرتی تھی۔ اور عدیل
کو اس کی یہ عادت بڑی محبوب تھی۔
کہ اس لمحے اس کی اپنی خود اعتمادی کچھ بڑھ جاتی۔ ذہنی لحاظ میں وہ اسے
اپنے سے برتر سمجھتا تھا مگر اس وقت اس کے کمتری کے احساس پر برتری کا احساس
غالب آ جاتا۔

وہ مرد تھا۔ دلیر اور نڈر مرد۔ اس کا محافظ۔ اور عورت۔ خواہ کتنی ہی عقل و
فہم والی کیوں نہ ہو۔ کمزور دل کی مالک ہوتی ہے۔ مرد کے بغیر وہ محفوظ نہیں
ہوتی۔ مرد ہی اس کی پناہ گاہ اور مرد ہی اس کا تحفظ ہوتا ہے۔
ٹھاہ کرنے کے لیے بالکل تیار جب وہ مسہری کے قریب پہنچا۔ تو وہیں
اس کے قدم رک گئے۔ مسہری کسی نامراد کے دل کی طرح یا کسی گم شدہ نگینے والی
انگوٹھی کی طرح خالی پڑی تھی۔

اور خالی بھی کچھ یوں۔ کہ جیسے بہت دنوں سے خالی ہی رہی تھی۔ بے شکن
ساتھ ہلکی ہلکی گرد کی تہہ۔
پھر۔ کوئل کہاں تھی۔؟

پریشان ہوتے ہوئے اس نے خیر و کو آواز دے ڈالی۔
”جی۔“ وہ شاید اس کے پیچھے پیچھے ہی چلا آیا تھا۔ پاس ہی کھڑا تھا۔
عدیل نے ابھی زبان سے کچھ بھی نہیں پوچھا تھا۔ نگاہ کے ہی سوال کو سمجھتے
ہوئے وہ جلدی سے بولا۔

خیر و سامنے کھڑا تھا۔
”بہت دن لگا دیئے۔“
وہ سنجیدہ سی آواز میں پوچھ رہا تھا۔
”بیس پچیس دن کا کام صرف ایک ہفتے میں نٹا کر آیا ہوں۔ حرام کی ٹیٹ
تو نہیں ناکھانی۔“
”لائیے یہ میں اٹھاؤں۔“

خیر و نے اس کے ہاتھ سے ہنڈل تھامنا چاہا۔
”نہیں۔“ وہ اسے پرے ہٹاتا ہوا اندر بڑھا چلا گیا۔
جہاں وہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی کام لیے بیٹھی ہوتی تھی وہ چھوٹا چوبی تخت خالی
تھا۔ اور۔ اس وقت اسے احساس ہوا کہ اس تخت میں کوئی خوبی، کوئی خوبصورتی
نہ تھی۔
وہ تو بیٹھنے والی کا وجود تھا جو اسے سجا سنوار دیتا تھا۔ اور اس وقت
دیران پڑا تھا۔

آہستہ آہستہ قدم رکھتا وہ خواہ گاہ میں جا پہنچا۔
شاید ابھی تک وہ پوری طرح صحت مند نہیں ہوئی تھی۔ بہت دبے دبے
پاؤں اٹھاتا وہ اندر گیا۔ کہ چپکے سے جا کر وہ اسے ٹھاہ کرے گا۔
بہت مزہ آیا کرتا تھا۔ جب وہ بعض وقت اپنے خیالات میں گم بیٹھی ہوا
کرتی تھی اور وہ خاموشی سے پیچھے سے آکر اسے ڈرا دیا کرتا تھا۔
پھر وہ ”ہائے“ کر کے اسی سے پیٹ جایا کرتی تھی اور کسی معصوم بچے کی طرح

”بیگم صاحبہ لاہور گئی ہوئی ہیں۔“

”کب کی؟“

عدیل کے ہاتھ سے پکیٹ پھسل کر نیچے جا پڑا۔

”پانچ دن ہو گئے۔“

”اور وہ۔“ وہ اپنا فقرہ بھی پورا نہ کر سکا۔ سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر

وہیں مسہری کے کونے پڑک گیا۔

”فری بی بی کا پوچھ رہے ہیں۔ ۹ دس دن کی چھٹی گزار کر میں جب واپس

آیا تو میری بیگم صاحبہ گھر میں اکیلی تھیں۔ وہ پہلے ہی کی چلی گئی ہوئی تھیں شاید۔“

عدیل چپ کا چپ رہ گیا۔ مزید کوئی بھی سوال نہ کر سکا۔

”صاحب! چائے پیئیں گے یا کافی؟“

”نہیں۔ کچھ نہیں۔ وہ الجھا الجھا سا بڑبڑایا۔“

”کھانا تیار کرنے میں ابھی وقت لگے گا۔ اتنے میں چائے۔۔۔“

”میں نے کھانا کچھ نہیں۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔“

وہ بڑے غصے میں تھا۔ خیر و چپ چاپ کمرے سے نکل گیا۔

اور نہ لباس تبدیل کرنے کا ہوش تھا۔ نہ اپنا۔ وہ پکیٹ اسی طرح زمین

پر پڑا تھا۔ وہی جیسے اتنے ارمانوں سے سینے کے ساتھ لگائے لگائے پٹدی سے

مری تک آیا تھا۔

جو تے بھی نہیں اتارے۔ اسی طرح ہاتھوں کے اوپر سڑکا کر مسہری پر

لیٹ گیا۔

کوئل اسے بغیر بتائے ہی چلی گئی تھی۔ کیوں؟ اس نے ایسا کیوں کیا؟

وہ اس کا شوہر تھا۔ وہ اس کی بیوی تھی۔ پھر بھی وہ اس سے پوچھے گچھے اسے

مطلع کیے بغیر چلی گئی تھی۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟

اس نے تو اس کی مرضی یا خواہش کے بغیر کبھی کوئی قدم نہ اٹھایا تھا۔ اس

نے اس کے شوہرانہ حقوق ہمیشہ بڑی خوبصورتی سے ادا کیے تھے۔ عدیل نے

سب کچھ اس پر چھوڑ دیا تھا۔ پھر بھی اس نے ہمیشہ اس کی اطاعت اور

فرمانبرداری ہی کی۔ کبھی اپنی مرضی چلانے کی کوشش نہیں کی۔ ہمیشہ اسی کی مرضی

اور خواہشات کو اول درجہ دیا۔

پھر۔ پھر اس نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے اسے بتایا کیوں نہیں؟ وہ آپ

ہی آپ لاہور کیوں چلی گئی؟

وہ سوچنے لگا۔

تب۔ تب۔ اچانک اسے اس رات والا جھگڑا یاد آگیا۔

وہ گھبرا کر، سٹیٹا کر، سیدھا ہو بیٹھا۔ وہ سب کیا ہوا تھا؟ وہ سب کیا ہوا تھا؟

اور پھر۔ بہت سارے لمحات، بہت سارے واقعات اس کی نگاہوں میں گھوم گئے

کوئل ہسپتال میں تھی۔ فری نے اس نے بہت ساری سیریں کی تھیں۔ بہت

ساری فلمیں دیکھی تھیں۔ رائیڈنگ کی تھی۔ پکنکس منائی تھیں۔ سیکنگ کی تھی۔

فری تو پارہ تھی پارہ۔ چنچل۔ شوخ۔ شریر۔ زندہ دل۔ اور زندگی بھرے

خوبصورت انداز میں لطف اندوز ہونے کا فن جانتی تھی۔

وہ پھر مسہری پر دراز ہو گیا۔

بڑے خوبصورت دن تھے وہ !!
وہ انہیں تصورات میں ڈوبا ہوا تھا۔

”صاحب! چائے“

خیرو نے اس کے پاس چائے لارکھی۔ اور پھر مزید کوئی بات کیے بنا کرے سے نکل گیا۔

اپنے خیالات میں، اپنے حسین تصورات میں ڈوبے ڈوبے چائے کی پیالی اٹھا کر اس نے ہونٹوں سے لگالی۔

مگر دوسرے ہی لمحے اس نے پیالی واپس پٹخ دی۔ انتہائی بد ذائقہ چائے تھی۔

”خیرو! وہ چلا پڑا۔“

”جی صاحب! حاضر ہوا۔“

”یہ چائے بنائی ہے۔؟“

”جی۔ جی کیا ہوا۔؟“

”شکر کتنی ڈالی ہے۔؟“

”دو پیچ۔“

”دو پیچ۔؟ وہ چیخ اٹھا۔“

”اور دودھ بھی اتنا زیادہ۔؟“

”وہ۔ دراصل صاحب! آپ کی چائے ہمیشہ بیگم صاحبہ خود بنایا کرتی تھیں۔“

مجھے اندازہ نہیں ہوا۔ لائیے اور بنا لاؤں۔“

”نہیں۔ رہنے دو۔ اور یہ بھی لے جاؤ۔“

”اب شکر بھی کم ڈالوں گا۔ اور دودھ بھی کم صاحب!“

”نہیں۔ وہ تلخی سے بولا۔“

”کہہ جو رہا ہوں کہ نہیں۔“

خیرو کان پسیٹ، چائے اٹھا، کمرے سے نکل گیا۔

عدیل پھر لیٹ گیا۔ اور ابھی۔ اپنے خیالات کی ہمراہی میں وہ کہیں بھی روانہ نہیں ہوا تھا کہ خیرو پھر اندر آ گیا۔

”صاحب! کھانا تیار ہے۔ آپ غسل وغیرہ کر کے آجائیے۔“

واپس جاتے جاتے وہ پھر رکا۔

”ٹھنڈا ہو کر بد مزہ ہو جائے گا۔“

”بد مزہ ہو جائے گا۔“ عدیل نے دانت کچکچائے۔

”چائے تو بڑی مزیدار تم نے پلائی ہے۔“

بڑبڑاتے ہوئے عدیل غسل خانے میں گھس گیا۔ جسم پر صابن مل کر پانی ڈالا تو اس کی چیخ سی نکل گئی۔ ٹھنڈے منج پانی نے اسے بھی برف کا تودہ بنا دیا۔ دانت

ایک دوسرے پر بٹھاتے ہوئے جلد جلد تھوڑا سا پانی اور ڈالا کہ جسم پر سے صابن تو اتر جائے۔ پھر تولیے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

غصے سے وہ پاگل ہوا تھا۔ وہاں تولیہ ہی نہیں تھا۔ اسی طرح گیلے جسم پر گاؤں پہن کر وہ باہر نکل آیا۔

”خیرو! اتنی زور سے چلایا کہ پہاڑ کے پتھروں نے بھی اس کی صدا سنی ہوگی۔“

پوچھا ضرور کرتی تھی۔

مگر یہ یہ اتنا لمبا سفر اور گھراکیلا چھوڑ کر۔

اس کی سوچ ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ خیر و کھانا لے کر آگیا۔

دو نمکے میں تھوڑا سا عجیب سے رنگ کا سالن تھا۔ ساتھ ایک پلیٹ اور

رومال میں دو چپاتیاں لپیٹی ہوئی تھیں۔

نہ کوئی سلاد۔ نہ چٹنی۔ نہ کوئی آلیٹ یا کباب وغیرہ۔ کیسا عجیب سا کھانا تھا۔

اس گھر میں تو کھانا اتنے اہتمام سے بنایا جاتا تھا۔ پھر اتنے خوبصورت طریقے

اور اس قدر اچھے سلیقے سے پیش کیا جاتا تھا کہ بھوک نہ بھی ہوتی تو نفاس

سے لگا ہوا دیکھ کر ہی اشتہا تیز ہو جایا کرتی تھی۔ اور آج۔ یہ۔!

اس نے تو آج دوپہر کو بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔ گھر آنے کے خیال سے بس

کام میں ہی لگا رہا تھا کہ وہیں جا کر خوب اچھی طرح کھائے گا۔ اس ہفتے کے نیم قسم

کے فاقوں کی کسر نکالے گا کہ کوئل گھر آچکی تھی۔

”کوئل بھلا کیوں چلی گئی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ مجھے ہفتہ کی شام کو گھر آنا

تھا۔ اس کے شوہر نے۔ اپنے گھر میں۔!“

اس نے کھانے کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ بالکل دل ہی نہیں چاہا۔ اسی طرح

واپس کر کے وہ چپ چاپ لیٹ گیا۔

کتنا بور ہوا تھا وہ گھر آ کر۔ مگر۔ یہی گھر تو تھا۔ جہاں اسے سکون ملتا تھا۔

ہر قسم کی آسائش میسر آتی تھی۔

ذہنی، جسمانی، روحانی۔ ہر طرح کی آسودگی اس اپنے گھر میں اسے حاصل

”جی صاحب۔!“

وہ کپکپاتا، لرزتا اندر آگیا۔

”تم نے مجھے غسل کرنے کے لیے کہا تھا۔“

”ہاں جی۔“

”تو جاؤ غسل خانے میں دیکھو۔ نہ وہاں تولیہ۔ نہ گرم پانی۔ جس تخی پانی سے

میں نہایا ہوں ذرا اس میں ایک لمحے کے لیے ہاتھ تو ڈال کر مجھے دکھاؤ۔“

”جی۔ جی۔“ اس کا سر جھجک گیا۔

”مجھے پتہ ہی نہیں تھا۔ دراصل یہ سب کام میں نے پہلے کبھی نہیں کیے تھے۔“

”پھر آخر تم کس مرض کی دوا ہو۔“

”جی میں دوسرے کام کیا کرتا تھا۔ آپ کے سب کام بیگم صاحبہ خود اپنے

ہاتھ سے کرتی تھیں۔“

فوراً ہی اس نے اپنی غلطی تسلیم کر لی تھی۔ پھر وہ اسے اور کیا کہتا۔؟

”کھانا یہیں لے آؤ۔ اور سنو۔ ذرا بیٹر بھی لگا دو۔ کسی طرح تو جسم میں

حرارت پہنچے۔“

مہری کے پاس بیٹر لگانے کے بعد خیر و کھانا لینے چلا گیا۔ وہ سوں سوں کر کے

ہاتھ پاؤں سینک رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔

کوئل کیوں چلی گئی تھی۔؟ اسے بتائے، اس سے پوچھے بغیر ہی کیوں چلی گئی

تھی۔ کہ پہلے وہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی کام نہیں کیا کرتی تھی۔ اسے ہر قسم

کی آزادی تھی۔ اس کی طرف سے کوئی پابندی نہیں تھی۔ مگر وہ پھر بھی اس سے

ہوا کرتی تھی۔ ہمیشہ۔!

پھر۔ پھر آج یہ۔ ہاں۔ اسے یاد آیا۔ ایسا ہی وقت ایک بار پہلے بھی اس پر آیا تھا۔ جب کوئل ہسپتال میں تھی۔

خیرو کو انہوں نے چھٹی پر بھیج دیا تھا۔ کہ وقت بے وقت وہ اور فری سیر سپاٹے یا فلم وغیرہ سے گھبراتے تھے تو وہ عجیب عجیب نگاہوں سے انہیں دیکھتا تھا۔ ان تمام دنوں میں بھی گھر اسی طرح چوہٹ رہا تھا۔ نہ خیرو کو گھر گریستی آتی تھی اور نہ فری گھر کے کام وغیرہ کرنا چاہتی تھی۔

مگر۔ مگر اسے ان دنوں احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ دن کچھ اور ہی انداز میں گزر رہے تھے۔ فری کی معیت میں۔ اس کی باغ و بہار صحبت میں۔ اس پر سپاٹوں میں۔!! تفریحات میں۔!!

اسے کچھ سوچنے، سمجھنے یا پرکھنے کا ہوش ہی کب تھا۔؟ وہ مسکرایا۔

وہ تو ڈوبا ہوا تھا۔ وہ تو کھویا ہوا تھا۔ فری کی محبت میں۔ اس کے سحر میں۔ باہوش انسانوں کو مدہوش کر دینے والی اس کی ہستی میں۔!!! فری عجیب ہی تھی۔ دوسروں کو پاگل کر دینے والی۔ دلوں کو موہ لینے والی۔ بن پتے ہی۔ اس کی اداؤں، اس کی باتوں گھاتوں کا نشہ ایسا چڑھتا تھا کہ تن من کا ہوش نہ رہتا تھا۔

یہ ایک اس کے پیٹ میں اک عجیب سی، انوکھی سی ٹیس اٹھی۔ عدیل گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ یہ کیسی تکلیف شروع ہو گئی تھی اسے۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ دوبارہ

پھر ایک لہری اٹھی۔

اوہ۔ اسے یاد آیا۔ یہ تو بھوک تھی جو اس کے معدے کو الٹ پلٹ کیے دے رہی تھی۔ اس کا پیٹ روٹی مانگ رہا تھا کہ وہ صرف صبح کے ہلکے سے ناشتے پر تھا پھر پھر کوئل یاد آئی۔ وہ گھر میں ہوتی تو اسے اس وقت یہ تکلیف تو نہ ہوتی۔ اچھا ستر کھانا اسے ملتا۔ پیٹ بھر کر کھانے کے بعد۔ گرا گرم اور مزیدار سی کافی یا چائے کی پیالی اسے ملتی۔ وہ مسہری پر نیم دراز سا ہو کر چائے یا کافی پیتا۔ اس کے پاس وہ بیٹھی، ہلکی ہلکی پیاری مسکراہٹوں کے ساتھ بڑی میٹھی میٹھی، دل کو سکون دینے والی باتیں کرتی۔

چائے ختم ہوتی تو وہ اپنا سر اس کی آغوش میں رکھ کر لیٹ جاتی۔ یا اس کا سر اپنی آغوش میں رکھ کر اسے لٹا لیتی۔ پھر اپنی نرم نرم انگلیوں اس کے بال سہلاتی اس کی آنکھوں سے اس کی ناک سے، اس کے ہونٹوں سے کھلتی سیاتھ ساتھ کوئی بڑی خوبصورت سی غزل گنگنائی جاتی۔

کتنا اچھا لگا کرتا تھا یہ سب کچھ۔ سارے دن کے دفتر کے کام کی تھکن یکدم دور ہو جاتی تھی۔ ذہن کو کیسی آسودگی اور رُوح کو کیسا سکون ملتا تھا۔! اور آج۔ وہ گھر میں نہیں تھی۔ اسی لیے۔ اسی لیے اس پر یہ وقت گزر رہا تھا۔

اور اس لمحے اسے احساس ہوا کہ کوئل کے بغیر اس کا گھر، گھر نہیں تھا۔ جب سے وہ آیا تھا۔ اسے کوئی آسائش، کوئی راحت، ذرا سا سکون یہاں نہیں ملا تھا۔

وہ سردی سے مٹھٹھڑا تھا۔ وہ بھوک سے تڑپ رہا تھا۔ اس کے نصیب میں تو چائے کی پیالی بھی نہیں ہوتی تھی۔

اور گویا اس کی زندگی بھر کی سوچیں اس لمحے مکمل ہو گئیں۔

اس کا گھر، اس کی پناہ گاہ تو صرف کولم تھی۔ کولم کی آغوش تھی۔ اس کا مشفق وجود تھا۔ اس کی سلیقہ مندستی تھی۔

وہی اس کے لیے آسائشیں مہیا کرتی تھی۔ وہی اسے زندگی کا ہر آرام پہنچاتی تھی۔ وہی اس کا سکون تھی۔ وہی اطمینان۔!

اچھا کھانا۔ اچھا پہننا۔ صاف ستھرا خوبصورت گھر۔ گھر کا اچھا انتظام۔ سب اس کے دم قدم سے تھا۔ سب اس کی برکت تھی۔

گویا اس کے وجود کے بغیر خود اس کا وجود نامکمل رہ جاتا تھا۔

”صاحب۔!“

خیرو کے آجانے پر اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ بکھر گیا۔

”مجھے آپ کو بتانا یاد ہی نہیں رہا تھا۔ کل کا یہ خط آیا پڑا ہے“

عدیل نے ہاتھ بڑھا کر وہ بند لفافہ مقام لیا۔ الٹ پلٹ کر دیکھا۔

”کس کا ہے جی۔؟ بیگم صاحبہ کا ہوگا۔ وہ کہیں بھی چلی جائیں لیکن آپ کا

اور گھر کا خیال وہ اپنے سے علیحدہ نہیں کر سکتیں جی۔“

خیرو اس کی مسہری کے پاس بیٹھ گیا۔ عدیل نے لفافہ کھولا۔

”خیریت سے تو ہیں نامیری بیگم صاحبہ۔؟ اور صاحب! جب جواب دیں

تو لکھ دیجیے گا کہ جلدی سے واپس آجائیں۔ ان کے بغیر آپ اور گھر۔۔۔“

”خیرو۔! جاؤ باہر۔“

عدیل کی ڈانٹ سن کر وہ چپکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ باہر جاتے جاتے بھی وہ مڑ مڑ کر خط ہی کو دیکھ رہا تھا۔

اس کے جانے کے بعد عدیل سیدھا ہو بیٹھا۔ خط میں سے بھی کولم کی مخصوص خوشبو آرہی تھی۔ بے اختیار اس نے وہ ورق ہونٹوں سے لگا لیا۔ پھر خود اپنے آپ پر مسکرا اٹھا۔ وہ کولم تو نہیں تھی۔؟ مگر اس کا خط تو تھا۔ بڑی خوشگوار سی دھڑکنوں کے ساتھ اس نے پڑھنا شروع کیا۔ کہ اس کے نام اس کی کولم کی پہلی تحریر تھی۔

اس سے دور تھی۔ لیکن پھر بھی اس کے لیے سکون و اطمینان فراہم کرنا نہیں بھولی تھی۔

محبتیں، پیار، خلوص۔ اس نے خط کے ذریعے ہی اسے سب کچھ بھیج دیا تھا۔

گنگنائے ہوئے سیٹی بجاتے ہوتے، مسکراتے ہوئے اس نے ورق کی تہیں کھولیں لاہور

عدیل۔!

میری یاد کو تم اب تک ماضی کی بھولی بسری یادوں میں شامل کر چکے ہو گے۔ مگر میرا حافظہ تمہاری یاد کبھی محو نہیں کر سکتا۔

زخم لگانے والے ہاتھوں کا لمس کبھی نہیں بھولتا۔ اور پھر تمہارے ہاتھ۔ میں تو ابھی تک اپنے ہاتھوں پر ان کا لمس محسوس کر سکتی ہوں۔

عدیل! میں نے تم سے جذباتی معنوں میں نہ سہی مگر ایک انوکھے انداز میں محبت کی ہے۔ جس کی گہرائی کا اندازہ تم نہیں کر سکتے۔ شاید کبھی بھی نہ کر سکو۔ ہم نے قریباً پانچ سال اکٹھے گزارے ہیں۔ ان پانچ سالوں کی یادیں میرا اثاثہ حیات ہے۔ اور موت کے آنے تک میرا زادراہ۔! ان میں حسین یادیں بھی ہیں اور بھیاں تک بھی۔!

مگر مجھے ان بھیاں تک یادوں سے بھی محبت ہے۔ کیونکہ یہی ان حسین یادوں کے حسن کو اجاگر کرتی ہیں۔

عدیل! اس دنیا میں کوئی کسی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ ہر ایک کو اپنا اپنا سفر تنہا ہی کاٹنا ہے۔ راہ میں چلتے چلتے کئی ہم سفر ملتے ہیں بعض کو موت جدا کر دیتی ہے۔ جن کی یادیں زیادہ تلخ نہیں ہوتیں۔

مگر۔ جنہیں حادثات چھین کر لے جائیں۔ وہ اپنے پیچھے نہایت ازیت وہ یادیں اور گہرے گھاؤ چھوڑ جاتے ہیں۔ اس لیے سمجھنا کہ مجھے موت نے تم سے جدا کر دیا ہے۔

جس زندگی میں میں خوشیاں بھرنے کی کوشش کرتی رہی ہوں میں نہیں چاہتی کہ میرے آنے کے بعد اس میں کم از کم میری وجہ سے تلخی کا ایک شائبہ بھی شامل ہونے پائے۔

تم نے آج تک میری خواہش کو رد نہیں کیا۔ اور آج میں تم سے اپنی ازدواجی زندگی کا آخری حق مانگتی ہوں۔ طلاق۔!

کوئل

عدیل نے خط کو کئی بار پڑھا۔ مگر اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ سب کوئل نہیں لکھ سکتی تھی۔ یہ سب کوئل نہیں لکھ سکتی تھی۔ پھر۔؟ یہ کس کا خط تھا۔؟ قیامت لے کر یہ کس کا نامہ اس کے نام آیا تھا۔؟ بڑی دیر تک اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ سکا۔ تحریر کوئل ہی کی تھی۔ وہ بڑی اچھی طرح پہچانتا تھا۔ مگر۔ مگر۔

وہ ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھا تھا۔ وہ سوچوں میں کھویا ہوا تھا۔ آخر یہ خط، ایسا خط کوئل نے اسے کیوں لکھا۔؟ اس خط کا محرک کیا تھا۔؟ کون سا جذبہ تھا۔؟

کیا وہ اس کی توقعات پر پورا نہیں اُترتا تھا۔؟ مگر نہیں۔ اس کے انداز سے تو اسے ایسا کبھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ بلکہ۔ بلکہ۔ وہ تو اس سے بے حد محبت کرتی تھی۔ اور اس نے تو اپنے خط میں بھی اس کے لیے محبت ہی کا اظہار کیا تھا۔ پھر۔؟ پھر۔؟

وہ اپنے ساتھ اس کا گزارا ہوا اک اک لمحہ یاد کرنے لگا۔ اور جب وہ یادوں کی اس برات کے ساتھ اس رات تک پہنچا۔

وہ ہسپتال سے واپس آئی تھی۔ ان کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ تب۔ تب۔ یکایک بہت سارے زہریلے ناگ اس کے ذہن میں جیسے سرک اُٹے۔ وہ اسے ڈسنے لگے۔

یہ اس نے کیا کیا تھا۔؟ یہ اس نے کیا کیا تھا۔؟ فری شوخ تھی۔ چنچل تھی۔ شعلہ تھی۔ شراب تھی۔ مگر۔ ذہنی لحاظ میں

وہ کومل سے بہت کم تر تھی۔

بہت معمولی۔ اور اس کی کومل۔ وہ تو ایک مثالی عورت تھی۔ اس نے اک سراب کے پیچھے بھاگ کر ٹھنڈے میٹھے چشے کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اس خلوص و وفا کے پکیر کے ساتھ یہ اس نے کیسی وفا کی تھی۔؟
”اور پھر میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی۔ میں نے تم سے شادی کا ارادہ کر لیا۔“

اسے اپنے منہ سے نکالا ہوا ایک ایک لفظ یاد آگیا۔
”نہیں۔ نہیں۔“ وہ یکدم چیخ پڑا۔

”میں نے زندگی میں عقلمندی صرف یہی کی تھی۔“
اس نے باعقل و ہوش اعتراف کیا۔

پھر۔ پھر۔؟ اوہ۔! یہ سب کیا ہو گیا تھا۔؟ وقتی جذبات کے ریلوں میں بہہ کر شیطان کے بہکائے میں آکر اس نے اپنا پرسکون، بسا بسا گھرا جاڑ لیا تھا۔ یہ اس نے کیا کیا تھا۔؟

کومل نے اسے ذہنی، جسمانی، روحانی، غرض ہر طرح کی آسودگی بخشی تھی۔ پھر۔ پھر وہ شیطان کے بہکائے میں کیوں آگیا تھا۔؟
فری کا اور کومل کا تو مقابلہ ہی کوئی نہ تھا۔ فری تپتی دھوپ تھی۔ پاؤں کو جھلسا دینے والی۔ تو وہ۔ وہ ٹھنڈا ٹھنڈا سایہ۔!

فری طوفان تھی جو ہمیشہ انسانوں کی تباہی کا باعث بنتا ہے۔ اور کومل پرسکون ندی۔ جو پیاسوں کی پیاس بجھاتی ہے۔!

پھر وہ پاؤں جھلسانے کیوں چلا تھا۔؟ اس نے تباہی کو گلے لگانے کی کیوں ٹھانی تھی۔؟ وہ پاگل ہو گیا تھا۔ کیوں۔؟ کیوں۔؟
اور اس کیوں کا بھی کوئی جواب اس کے پاس نہ تھا۔ تب پچھتاووں نے اسے آگھیرا۔ وہ خود کو کوسنے لگا۔

وہ ظالم تھا۔! وہ مجرم تھا۔! وہ قاتل تھا۔!!!
کومل کس طرح گئی ہوگی۔؟ کومل پر کیا کیا نہ بیت گیا ہوگا۔؟
اور اب۔ وہ گھر۔ جہاں کومل مہکتی تھی۔ جہاں کومل مسکراتی تھی۔ جہاں کومل مجتہدیں بکھیرتی تھی۔ جہاں کومل اس کے لیے آسودگی اور آسائشیں مہیا کرتی تھی۔
اب اس کے بغیر وہ اک ویرانہ تھا۔ اسے یہاں سانس لینا دشوار تھا۔ اسے یہاں کوئی آرام و سکون نہیں ملا تھا۔

کومل۔! کومل۔! کومل۔!!!

اس کا ہر جذبہ اسے ہی پکار رہا تھا۔

ساری رات اس نے ٹہل ٹہل کر، بیٹھ بیٹھ کر، اٹھ اٹھ کر، سوچ سوچ کر اور اپنے آپ کو کوس کوس کر گزارا۔

صبح کے اُجالے کی پہلی کرن کے ساتھ ہی وہ اٹیچی میں چنڈ کپڑے اور ضرورت کی کچھ چیزیں مٹھونس مٹھانس لاہور کے لیے روانہ ہو گیا۔

اتمی آبا کو اس نے سب کچھ بتا دیا تھا۔ صرف اس لیے۔ کہ کسی طرح وہ عدیل اور فری کے راستے سے ہٹ جائے۔

عدیل کی زندگی سے خود چپکے سے نکل کر فری کو اس میں داخل کر دے۔ کہ وہ دونوں۔ ایک دوسرے کی خوشی تھے۔ ایک دوسرے کی محبت تھے۔

مگر۔ اس کی یہ سوچ بیکار ہی گئی۔ اپنی ذات کے لیے اس نے جو فیصلہ کیا تھا اس کے متعلق تو نہ اتمی نے کچھ کہا نہ آبانے۔ لیکن فریحہ کو عدیل کے ساتھ بیاہنے سے انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

کومل کے خیال میں ان کا غصہ وقتی تھا۔ سوچا۔ دو چار دن میں ہی اس نے اتمی اور آبا کو آہستہ آہستہ سمجھا کر راضی کر لینا تھا کہ فری بھی آخر ان کا خون تھی۔ اسے زندگی کی خوشیاں دینے کے لیے بھی انہیں ہی تگ و دو کرنا تھا۔ چنانچہ اپنی طرف سے ان کی راہ ہموار کرنے کے لیے اگلے ہی دن اس نے طلاق کے لیے عدیل کو خط لکھ دیا۔ اسی طرح تو وہ ان کے لیے کچھ کر سکتی تھی۔ صرف یہی ایک طریقہ تھا۔ یا پھر۔ موت۔!

اور وہ خدا کے ہاتھ میں تھی۔ آج آئے یا چالیس سال بعد۔ اور خود بلائی موت حرام ہوتی ہے۔

وہ خدا کے بنائے ہوئے قوانین و ضوابط توڑ کر اتنے بڑے گناہ کو گلے نہیں لگا سکتی تھی کہ اس نے تو ہمیشہ چھوٹے سے چھوٹا گناہ کرنے سے بھی گریز کیا تھا۔ اس کے ضمیر نے اسے ہمیشہ نیکی کی راہ پر ہی چلایا۔

عدیل کو خط پوسٹ کر کے وہ اس کے جواب کی منتظر تھی۔ مگر۔ ابھی شاید

کومل اپنے پرانے کمرے کی اسی بالکنی میں سہیلیوں پر مٹھوڑی ٹکاتے بیٹھی بے معنی نظروں سے دور سڑک کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اس کا ذہن پچھلے پانچ چھ دن میں رونا ہونے والے حادثات و واقعات میں الجھا ہوا تھا۔ کیا کیا کچھ ہو گیا تھا۔ وہ سوچوں میں کھوئی تھی۔ اسے سب کچھ یاد آ رہا تھا۔

عدیل کو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ آئی تھی۔ رنج و غم کی اک لہری اس کے وجود میں اُتر آئی۔ اور دکھ کا یہ زہر اس کی پوری ہستی میں جیسے قطرہ قطرہ کر کے سرایت کرنے لگا۔ اس کی زندگی ختم ہوئی جا رہی تھی۔ اس کی حیات میں تار یکیاں پھیلی جا رہی تھیں۔

ٹوٹتی، بکھرتی، اندھیروں سے مگراتی وہ پھر یادوں کے ساتھ ساتھ چل پڑی۔

اس تک اس کا خط پہنچا بھی نہ تھا۔
 اسی سہ پہر تانے فریجہ کا رشتہ طے کر دیا۔ جانے اتنی جلد یہ سب انہوں نے
 کیسے کیا۔؟ اسے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔
 وہ اپنے کمرے میں تھی۔ امی کے بلانے پر نیچے گئی تو وہ ایک بڑا بکس کھولے
 بیٹھی تھیں۔

”اؤ ذرا میرا ہاتھ بٹاؤ۔“

”یہ سب کپڑے۔“ جھلمل جھلمل کرتے ملبوسات کو وہ حیرت سے دیکھنے لگی۔
 ”فری کی شادی کے ہیں۔“

امی نے اس کے ادھورے سوال کا بھی جواب دے دیا۔

”بہت اچھے ہیں۔ بے حد پیارے۔ خدا مبارک کرے۔“

اس نے بڑے خلوص سے ان کی تعریف کی۔

”مگر اس وقت کیوں کھولے بیٹھی ہیں امی۔؟“

”دیکھتی ہیں ناکہ مکمل کتنے ہیں۔ پرسوں اس کا عقد ہے۔“

”کیا۔؟“ کوئل پھٹی پھٹی آنکھوں سے ماں کو دیکھتے ہوئے چیخ پڑی۔

”آہستہ بولو۔“ امی نے ہولے سے کہا۔

”یہ ایک دم ہی۔ مگر کس کے ساتھ۔؟“

”تمہارے آباہی کے کوئی ملنے والے ہیں۔“

”فری سے پوچھا ہے۔؟“

”نکاح کے وقت پوچھ لیں گے۔“ امی نے بڑی بے پرواہی سے کہا۔

”نہیں۔ امی نہیں۔“ وہ احتجاجی انداز میں بولی۔

”کیوں نہیں۔؟“ امی نے اسے گھورا۔ پھر قدرے دشتی سے کہنے لگیں۔

”تمہارے آباہی یہی مرضی ہے۔ میں تو کچھ نہیں کر سکتی۔“

”اور اگر نکاح کے وقت اس نے انکار کر دیا۔ تو۔؟“

”نہیں کرے گی۔“ وہ پورے وثوق سے بولیں۔

”یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں۔؟“

”میں نے اسے جہنم دیا ہے۔ پالا پوسا ہے۔ میں اس کی طبیعت اور عادات

سے اچھی طرح واقف ہوں۔“

امی بڑی سنجیدہ تھیں۔ کوئل نے انہیں اس ارادے سے باز رکھنے کی اک
 کوشش اور کی۔

”لیکن امی! یہ شرع شریعت کے بھی۔“

”بس! امی نے اس کی بات کاٹ دی۔“

”اب تم خاموش رہو۔ اور جیسے سب کچھ شرع شریعت کے مطابق ہوا

ہے۔ میری زبان نہ کھلواؤ۔ وہ کھلی تو ساتھ میرے زخم بھی کھل جائیں گے۔“

”امی۔!“

”اؤ بیٹھو۔ اور باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔“

امی کے لہجے کی انداز کی سنگینی نے اسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔

وہ چپ چاپ ان کے ساتھ مل کر فری کے کپڑے وغیرہ تیار کرنے لگی۔

اگلا دن سارا شاپنگ کرتے گزرا۔ فری کے بیاہ کے لیے پہلے سے ہی تانے کچھ

جمع جوڑ کر رکھا تھا۔ کومل کی شادی جتنے وسیع پیمانے پر تو نہیں، البتہ مقوڑی تھوڑی ہی سہی ہر چیز فراہم کر لی گئی۔

جس جس کو مدعو کرنا تھا ابا نے خود ہی کسی کو فون کر کے اور کسی کے پاس خود جا کر اس کی شادی کی اطلاع دے دی۔

بچپن میں گڑیا گڈے کی شادی بھی دونوں بہنیں اس سے کچھ زیادہ ہوم دھام اور شور شرابے سے کیا کرتی تھیں۔

فری اپنے کمرے میں ہی گھسی رہی۔ سب کچھ دیکھا۔ یا شاید نہیں۔ لیکن نہ اس نے کچھ پوچھا۔ نہ بولی۔

نکاح کے وقت گواہ اس کے دستخط کرانے اس کے پاس گئے تو کومل دھک دھک کرتے دل کو تھام کر اپنے کمرے میں گھس گئی۔

جانے کیا ہونے والا تھا۔ جانے کیا ہونے والا تھا۔؟

اندازہ اس کا یہی تھا کہ فری اس شادی سے انکار کر دے گی اور ابھی ساری برادری کے سامنے اس کے ابا کی بے عزتی ہو جاتے گی۔ ان کی ناک کٹ جائے گی۔

مگر۔ یکایک مبارک باد کی صدائیں گونج اٹھیں۔ تب اسے معلوم ہوا کہ نکاح بخیر و خوبی ہو گیا تھا۔

نکاح کے بعد رخصتی بھی ہو گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے خواب کی کیفیت سے وہ گزر رہی تھی۔

رخصتی کے وقت اُمی ابا نے باری باری فری کو گلے لگا کر اسے شاد و آباد

رہنے کی دعائیں دیں۔ پھر۔ پھر وہ اس کے پاس گئی۔ اس کی حقیقی اور بڑی بہن تھی۔

دہن بنی فری کا جھکا ہوا چہرہ اس نے اونچا کیا۔ چپکتے دیکتے زیورات، عروسی سرخ جوڑے اور سنگھارنے اسے بے حد خوبصورت بنا دیا تھا۔ کئی لمحے وہ اسے دیکھتی رہی۔

پھر یکایک کومل کی آنکھوں سے ڈھیر سارے آنسو بہہ نکلے۔

اسے عدیل سے محبت تھی اور وہ کسی دوسرے شخص سے بیاہی جا رہی تھی کچھ بھی تھا۔ فری اس کی بہن تھی۔

اس کی ناکام محبت پر اس کی مٹنے والی آرزوؤں اور حسرتوں پر اسے رونا آگیا۔ بہت ڈھیر سارے دکھ اس کے سینے میں اتر گئے۔

”میں تمہارے لیے بہت کچھ کرنا چاہتی تھی میری بہن۔ بہت کچھ مگر مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں کچھ بھی نہ کر سکی۔ میرے سارے ارادے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ اور زبردستی تمہیں ایسے ہاتھوں میں سونپا جا رہا ہے جن کے متعلق تم کچھ بھی نہیں جانتیں۔ جانے وہ کیا انسان ہے۔؟ میں بھی نہیں جانتی۔ خدا تمہارے نصیب اچھے کرے۔ خدا تمہیں سارے جہاں کی خوشیاں عطا کرے۔ میرے حصے کی بھی۔“

لیکن یہ سب وہ محض دل میں سوچ سکی۔ زبان سے اک دکھ بھری آہ کے ساتھ صرف ایک لفظ ہی نکلا۔

”فری۔!“

اسی لمحے فری نے بند آنکھیں کھولیں۔ وہ شاید نہیں جانتی تھی کہ اتنی دیر سے ٹکلی باندھے اسے کون دیکھ رہا تھا۔

اور جب سامنے کومل کھڑی نظر آئی۔ اس سے نگاہیں چار ہوئیں تو کیدم اس نے سر کو جھٹکا دے کر اپنی مٹھوری اس کے ہاتھ سے چھڑالی۔
اس کی آنکھوں میں ناراضگی تھی۔ نفرت تھی۔ جیسے اس کے ساتھ یہ سب کچھ کومل نے کیا تھا۔

کومل کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اس کی ہر نیکی سب نے کیوں بُرائی کا روپ دھار لیتی تھی۔؟؟

اب بھی اس نے اتنی بات سے بات کی تھی تو اس کی خاطرنا۔ اور اگر انہوں نے کیدم اس کا کہیں اور بیاہ کر ڈالا تھا تو اس میں اس کا کیا قصور۔؟ اس نے تو نہیں کہا تھا۔

اس نے تو طلاق کے لیے عدیل کو بھی خط لکھ دیا تھا۔ اسی کی خاطرنا۔ اسی کی خوشی کے لیے نا۔ اسی کی راہوں کے کانٹے اس نے اپنے ہونٹوں سے اپنی پلوں سے چننے کی کوشش کی تھی نا۔

اور فری پھر بھی اسی سے ناراض تھی۔ الوداعی پیار دینے کے لیے کومل نے اسے گلے سے لگایا تو وہ ایک جھٹکے سے پرے ہٹ گئی۔ جیسے کومل کوئی زہریلی ناگن تھی اور ابھی اس نے اسے ڈس لینا تھا۔

کومل آنسو بہاتے ہوئے پرے ہٹ گئی۔ اس کے مقدر میں ہی خرابی تھی۔ وہ چپ چاپ اوپر اپنے کمرے میں ابھی۔

لڑکی کی رخصتی کے بعد کی دیرانی نہ صرف ان کے گھر میں اُتر آئی تھی بلکہ شاید سب کے دلوں میں بھی اُتر آئی تھی۔

بڑا پرہول سا سناٹا چھا گیا تھا۔ نہ کومل نے رات کا کھانا کھایا نہ اتنی اور ابا نے۔ فری جس طرح اس گھر سے یکایک اور خاموشی سے رخصت ہو گئی تھی شاید ہر کوئی اپنے آپ کو ہی اس کا مجرم گردان رہا تھا اور ذمہ دار ٹھہرا رہا تھا۔

ابا اتنی سے الجھ رہے تھے اور اتنی کینز سے۔ بات بے بات۔ وجہ بلا وجہ۔! کچھ بھی تھا۔ فری ان کی اولاد تھی۔ ان کا خون تو تھی۔!!
اگلی صبح بھی بڑی خاموش تھی۔ وہ سارا دن بھی اسی طرح خاموشی اور دیرانی میں کٹا۔ کومل اوپر اپنے کمرے میں ہی پڑی رہی۔

شام کو فری نے واپس میکے آنا تھا۔ اور دستور کے مطابق گھر کے سبھی افراد نے اسے لینے جانا تھا۔ مگر کومل نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر جانے سے انکار کر دیا۔

درحقیقت وہ فریج کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ دلہن بنی نے اس پر اپنی ناراضگی کا اظہار کر دیا تھا تو اب۔ اب سب نے کیا کرے۔؟

منہ پھٹ تو بہت تھی۔ کہیں سب کے سامنے ہی اس کی بے عزتی نہ کر ڈالے۔ اسے ذلیل نہ کر دے۔ دل کی نفرت و حقارت سب کے سامنے ہی اس پر اگل نہ دے۔

اپنی ناکام حسرتوں اور لٹی تمناؤں کا نوحہ سب کے سامنے ہی نہ سنانے لگے اپنی برباد محبت کا ماتم سب میں نہ کرنے لگے۔ کہ اب یہ خود اس کی ذات کے لئے

کے لیے مناسب نہ تھا۔ اب اس کے ساتھ اس کی زندگی کا ایک ساتھی بھی تھا۔
فری نے تو یہ سب کچھ نہیں سوچنا تھا۔

ان سب سوچوں کے تحت وہ گھر میں ہی اکیلی پڑی رہی کہ نہ فری کو وہ
دکھائی دے گی نہ وہ آپس سے باہر ہوگی۔

اس کے علاوہ خود اس کا اپنا دل حد درجہ ادا اس تھا۔ اندر ایسا ویران
ہو رہا تھا جیسے ہزاروں سال پرانے کھنڈر۔ سب کچھ ٹوٹا بکھرا تھا۔ اور وہ اس
ٹوٹے بکھرے من کو لے کر کہاں جاتی۔؟

گہری رات ہوئی امی آبا واپس آئے۔ کینز بھاگی بھاگی اوپر پہنچی۔ اور فریحہ
دلہن کی آمد کا کومل کو بتایا۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ نیچے جانے کے متعلق سوچ ہی رہی تھی کہ پھر
وہی خیال ذہن میں گھس آیا۔

کیا فائدہ تھا نئے نویلے بہنوئی کے سامنے بے عزتی کروالینے کا۔ اپنی عزت
لیے پھر چپ چاپ وہیں بیٹھی رہ گئی۔ جانے کب تک فری کا غمہ طے۔ اور جب
تک اس کا غصہ نہ ملتا وہ اسے اکیلے میں تو مل سکتی تھی مگر سب کے سامنے نہیں۔

تیز تیز قدموں کی چاپ پر کومل نے نگاہیں اٹھائیں۔ فریحہ اندر آ رہی تھی۔
نجانے کس موڈ میں تھی۔؟ زبان پر نامراد یوں کے دہکتے انگارے۔؟ نگاہوں میں
نفرت، حقارت یا۔ یا۔

”باہجی۔! میری پیاری باہجی۔!!“

اس کی سوچ ادھوری ہی رہ گئی۔ فری کی آواز میں شہنائیوں کی گونج تھی۔

چوڑیوں کی جھنکار تھی اور مدھ بھرے نغموں کی الاپ۔!
وہ بھاگی بھاگی آکر اس سے لپٹ گئی۔

”آپ ہمیں؟“ پھر وہ عجب انداز میں لبجائی۔
”آپ اپنے دو لہا بھائی سے ملنے نیچے نہیں آئیں۔؟“
وہ بڑے پیار سے شکوہ کر رہی تھی۔

”وہ۔ وہ۔“ کومل ابھی کوئی جواب نہ دے پائی تھی کہ فریحہ خود ہی پھر
بول پڑی۔

”ہائے باجی! میں آپ کو کیا بتاؤں کہ جنید کیسے انسان ہیں۔ اتنے اچھے۔
اتنے ہنس مکھ۔ اور۔ اور!“

پھر وہ قدرے شرمائی۔

”اتنی محبت کرنے والے۔ یہ دیکھیے انہوں نے مجھے رونمائی میں یہ کندن کا
پورا سیٹ اور کنگن دیئے ہیں۔ لکھتی ہیں۔ بہت بڑے لکھتی ہیں۔“

انہیں زیورات کی چمک جیسے اس کے چہرے پر بکھری تھی۔

”باہجی! میں اپنی زندگی کا ساتھی بالکل ایسا ہی چاہتی تھی۔ جنید سید
آئیڈل ہیں!“

کومل حیرت سے اسے تک رہی تھی۔

یہ سب کچھ وہ ظاہر میں ہی نہیں کہہ رہی تھی بلکہ اندرونی خوشی اس کی
ایک ایک حرکت، ایک ایک لفظ سے عیاں تھی۔

اس کے چہرے پر قوس و قزح کے سے خوبصورت رنگ تھے۔ اس کی آنکھوں

میں انوکھی سی چمک تھی۔ جیسے پوری کی پوری لہکشاں وہیں اتر آئی تھی۔
 ”اور ہاں۔ میری شادی میں کیا عدیل بھائی کو نہیں بلایا تھا۔؟ وہ آجاتے
 تو جنید سے مل کر بہت خوش ہوتے۔“
 ”عدیل بھائی۔“ کوئل اور بھی زور سے چونکی۔
 ”آپ نیچے نہیں آئیں گی۔؟ آئیے نا۔“
 وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں اگر دو منٹ اور یہاں ٹھہری تو میرے پیچھے پیچھے آجائیں گے۔ ایک
 پل میرے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور آپ نے ابھی لباس وغیرہ تبدیل کرنا ہوگا۔
 اسی طرح نیچے نہ آجائیے گا۔ آپ نے جنید سے پہلی بار ملنا ہے۔ اور میں نے آپ
 کی اور عدیل بھائی کی ان کے سامنے بہت ساری تعریفیں کی ہوئی ہیں۔“
 وہ جلدی سے اس کے قریب آئی۔ جھک کر ہولے سے کوئل کے کان میں بولی
 ”آپ مری کب واپس جا رہی ہیں۔؟ ہمارا ارادہ ادھر ہی ہنی مون منانے
 کے لیے جانے کا ہے۔“

پھر یکدم اس کے لہجے میں گھمنڈ سا ابھرا آیا اور گرون تن گئی۔ ”مری کا ارادہ
 تو عدیل بھائی اور آپ کی خاطر کیا ہے۔ جنید تو سوئٹزر لینڈ جانا چاہتے تھے مگر
 شادی اتنی عجلت میں ہوئی کہ ابھی میرا پاسپورٹ نہیں بنا۔ ویسے کوشش کر رہی
 ہیں۔ جلد ہی ادھر بھی۔۔۔“ پھر وہ چونکی۔ ”ارے! میں آپ سے باتوں میں لگ
 گئی اور وہ میرا انتظار۔۔۔“

اور وہ عجب شرمیلی شرمیلی سی مسکراہٹیں ہونٹوں پر سجائے تیزی سے نیچے اتر گئی

کوئل کو نہ اپنی آنکھوں پر اعتبار آ رہا تھا نہ اپنے کانوں پر۔
 یہ سب کیا تھا۔؟ یہ سب کیا تھا۔؟

ایک رات جنید کے ساتھ گزاری تو وہ اس کا آئیڈیل بن گیا۔ وہ اس کے
 عادات و خصائل سے واقف نہیں تھی۔ وہ اس کے مزاج اور افتاد و طبع سے
 نا آشنا تھی۔ وہ اس کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ بالکل اجنبی۔!
 اور پھر بھی صرف ایک رات میں وہ اس کا آئیڈیل بن گیا۔ محض اس لیے
 کہ وہ ایک دولت مند مرد تھا۔

عدیل سے زیادہ قابل نہیں تھا۔ اس سے زیادہ وجہ نہیں تھا۔ اس جیسی
 پرکشش شخصیت کا مالک نہیں تھا۔

پھر بھی وہ اس کا آئیڈیل بن گیا تھا۔ ایک رات میں۔ صرف ایک رات میں!
 یہ کیسی محبتیں تھیں۔؟ یہ کیسی وفا میں تھیں۔؟
 اس کا اعتماد ہر چیز سے اٹھ گیا۔ سب جذبے جھوٹے تھے۔ محبتوں کے
 سب دعوے غلط تھے۔ وفاؤں کے عہد فریب تھے۔ دھوکا تھے۔

اور یہ انسان۔ روپ بدلتے انسان۔ اپل پل میں ان کی محبتیں بدلتی
 تھیں اور پل پل میں آئیڈیل۔!
 وہ کس دنیا میں بس رہی تھی۔؟

یہ اس کی دنیا نہیں تھی۔ یہ اس کی دنیا نہیں تھی۔
 یہاں تو لوگ محبت کرنا بھی نہیں جانتے تھے۔ یہاں تو لوگ وفا کے نام سے
 نا آشنا تھے۔

ہیر رانجھا۔ سسی پنوں اور سوہنی مہینوال کے دیس میں بنے والے لوگ
 بھی محبت کرنا نہیں جانتے تھے۔ وفا کے نام سے نا آشنا تھے۔!
 کتنا ظلم تھا۔! کیسا اندھیر تھا۔!!
 بریک لگنے کی تیز آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اپنے خیالات سے جھپکتے
 ہوئے اس نے جلدی سے نیچے پھاٹک کی طرف دیکھا۔
 عدیل ٹیکسی سے اتر رہا تھا۔
 ”اور پھر میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی۔ میں نے تم سے شادی
 کا ارادہ کر لیا۔“
 اس کے کانوں میں عدیل کے الفاظ گونج اُٹھے۔ گھبرا کر اس نے کانوں
 پر ہاتھ دھر لیے۔
 وہ فری کے لیے آیا تھا۔ وہ فری کے لیے آیا تھا۔ لیکن۔ فری تو جا چکی
 تھی اپنے نئے آئیڈیل کے پاس۔!
 کومل کو ہنسی آگئی۔ اس ہنسی میں کیا کچھ نہ تھا۔
 آنسو۔ طنز اور بہت سارے دکھ۔!!
 گھر میں اس وقت وہ اکیلی تھی۔ امی آبا فری اور اس کے دو لہا کے ساتھ
 ماموں کے ہاں گئے ہوئے تھے۔
 ساتھ چلنے کو کہا اسے بھی گیا تھا مگر اس کا دل ان ہنگاموں سے دُور ہی
 رہنا چاہتا تھا۔
 امی آبا کو اندر سے معلوم تھا کہ اس نے پھر طبیعت کی خرابی کا بہانہ ہی بنایا

تھا مگر پھر بھی انہوں نے اصرار نہیں کیا۔ اس کا بھرم رکھنے کے لیے چپکے سے
 بہانے کو سوچ مان لیا۔
 یوں وہ اپنی دیرانیوں کے ساتھ گھر میں اکیلی تھی۔ عدیل سیدھا اوپر
 ہی چلا آیا۔
 کومل نے سیڑھیاں چڑھنے کی وہی مانوس آواز سنی۔ اس کو یوں لگا جیسے ابھی
 فریج کی آواز اُبھرے گی۔
 ”یہ ہیں میری باجی کومل۔ اور باجی! یہ ہے عدیل میرا کلاس فیلو۔؟“
 اور عدیل اپنے اسی معصومانہ اور محبوبانہ انداز کے ساتھ اس کے سامنے
 آکھڑا ہوگا۔
 ”کومل۔!“
 عدیل نے دروازے میں ہی کھڑے کھڑے اسے پکارا۔
 وہی آواز۔ دل کے اندر اتر جانے والی آواز۔!!
 جی چاہا۔ بھاگ کر اس سے لپٹ جائے۔ مگر۔ اسے تو فری سے محبت تھی۔
 کومل چند لمحے خاموش رہی۔ دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ بڑی مشکل
 سے دھڑکنوں کو ہوا کر لیا۔ پھر آہستہ سے اُٹھ کر پیچھے مڑی۔
 ”کون۔؟“
 اجنبیت کے سائے اس کی آنکھوں میں لہرائے۔
 ”میں ہوں کومل۔! عدیل۔“
 ”فری تو اپنے آئیڈیل کے پاس چلی گئی۔ تم بہت دیر کر کے آئے ہو عدیل۔!“

وہ آہٹائی سپاٹ لہجے میں بولی۔
 ”اوہ۔! عدیل اس کے قریب بڑھ آیا۔
 ”میں فری کے پاس نہیں۔ تمہارے پاس آیا ہوں۔ اپنی کول کے پاس۔
 اپنی زندگی کے پاس۔!“

”یہاں تمہارا کوئی نہیں ہے۔“
 ”ہے کیوں نہیں؟ دنیا میں جو کوئی میرا اپنا ہے وہ صرف یہیں ہے۔“
 ”تمہیں میرا خط مل چکا ہوگا۔؟“

”ہاں۔“

”پھر۔؟“ وہ اسی جذبات سے عاری آواز میں پوچھ رہی تھی۔
 ”تو کیا تم واقعی اس قدر بے رحم ہو سکتی ہو۔؟ کیا تم واقعی۔۔۔“
 ”اے عدیل! میں واقعی بہت سنگدل ہوں۔ اور اگر تمہارا خیال ہے کہ تم
 اپنی باتوں سے اس پتھر کو گھٹلا لو گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔“
 کول نے بڑے سکون سے کہا۔

”یہ۔ یہ تم کہہ رہی ہو کول! جو میری زندگی میں خوشیاں بھرنے کی خواہاں
 تھی۔ جس نے میرے لیے اتنی قربانیاں دیں۔“
 ”اے عدیل! میں وہی کول ہوں۔ مجھے پہچانو۔ مگر کاش! تم مجھے پہچان
 سکتے۔“

”کول! ایک بار پھر اپنے فیصلے پر غور کرو۔“

اس کی آواز میں التجا تھی۔

”شاید تمہارے دل کے کسی کونے میں میری محبت موجود ہو۔ مگر نہیں۔ میں
 تمہاری محبت کے قابل نہیں۔ میں تم سے رحم کا طلب گار ہوں۔ مجھے معاف
 کر دو کول۔؟ مجھے معاف کر دو۔ میں اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہوں۔“
 وہ اس کے سامنے جھک گیا۔

”مجھے اب۔ تم سے بچھڑنے کے بعد۔ اپنی زندگی پر تمہاری سدا کی جدائی کا
 سایہ منڈلاتے ہوئے دیکھ کر احساس ہوا ہے کول! کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ سب
 سے زیادہ۔ سب سے گہری۔ میں تمہارے بغیر ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔“
 اس کی آواز میں شرمندگی تھی۔ افسردگی تھی اور ہزاروں پچھتاوے۔

”میری زندگی کو یوں دیران نہ کرو کول! ابھی تو اس میں آرزوؤں کے
 پھول بھی نہیں کھلے۔ ابھی تو ہم نے ایک دوسرے کو پہچانا بھی نہیں۔ واپس جاؤ
 کول! میں تمہاری منت کرتا ہوں۔“

کول بہت بنی کھڑی رہی۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔ قدرے توقف
 بعد وہ بولی۔

”عدیل! مجھے تمہاری ذہنیت پر ہنسی آتی ہے۔ تم کس قسم کی محبت کے قابل
 ہو۔ جس کا احساس صرف جدائی کے بعد ہوتا ہے۔ یہ محبت تو نہیں۔ یہ تو نقصان
 کا افسوس ہے۔ کسی بھی چیز کے کھو جانے کا صدمہ۔!“
 تلخ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھرائی۔

”جو چند دنوں میں مندل ہو جائے گا۔ ذہن سے اتر جائے گا۔ محبت میں
 تو انسان ایک رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ پھر محبت ہستی کا لایتناہ جزو بن جاتی ہے۔“

پھر محبت ہوا کی طرح اہم ہو جاتی ہے۔ زندگی کے ہر لمحے کے لیے۔
وہ چپ چاپ سر جھکائے کھڑا تھا۔ کوئل بڑی سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔
”اور۔ جس دکھ کا تم رونا۔ لے کر آئے ہو یہ محبت تو نہیں۔ اتنا افسوس
تو تمہیں اپنی کسی بھی چیز کے کھو جانے کا ہو سکتا ہے۔ اور ایسی ہر چیز تمہیں دوبارہ
مل سکتی ہے۔ میرے چلے آنے سے تمہاری زندگی میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے عدیل!
وہ عارضی ہے۔ جو چند دنوں، مہینوں یا سالوں بعد پر ہو جائے گا۔ کسی اور
کوئل سے۔ مگر۔“

اک زہر بھری مسکراہٹ پھر اس کے لبوں پر تیری۔
”تم اس سے بھی محبت نہیں کر سکو گے۔ تم کسی سے بھی محبت کرنے کے اہل
نہیں عدیل۔! اور شاید یہی تمہاری زندگی کی ٹریجڈی ہے۔ دنیا میں ہر شخص محبت
کرنے کا بھی اور چاہے جانے کا بھی اہل نہیں ہوتا۔ البتہ تم۔ صرف چاہے جانے
کے اہل ہو۔ اور سچ مانو عدیل! میں نے تمہیں اپنے دل و جان سے چاہا ہے۔ پورے
خلوص سے چاہا ہے اور سچے جذبوں سے چاہا ہے۔ اب اس سے زیادہ میں کچھ نہیں
کہنا چاہتی۔“

”میں تو بڑی امیدیں لے کر آیا تھا کوئل۔!“

عدیل نے مایوسی بھرے لہجے میں کہا۔

”کہ تم میرا دامن مراد کے پھولوں سے بھردوں گی۔“

”کاش! میں ایسا کر سکتی۔ مگر جب خود میرے دامن میں انگارے ہی انگارے

ہیں تو میں پھول کہاں سے لاؤں۔؟ اور شاید یہ انگارے تم قبول نہ کرو۔“

”مجھے سب کچھ قبول ہے کوئل۔! مجھے سب کچھ قبول ہے۔ بس! میری
زندگی میں لوٹ آؤ۔ میں تمہارے بغیر۔“
”نہیں نہیں۔“ کانوں پہ ہاتھ دھر کر وہ چیخ پڑی۔
”ایک بار پہلے بھی تم نے یہی سب کچھ کہا تھا۔ پھر تمہاری اپنی ہی زبان
نے اس کی تردید بھی کر دی۔ اور اب۔ تم چلے جاؤ یہاں سے۔ مجھ میں ایک
بار پھر وہ سب سننے کی تاب نہیں۔ چلے جاؤ۔ چلے جاؤ۔“

وہ دیوانوں کی طرح چیخ رہی تھی۔

”تم لوگ محبت کرنا نہیں جانتے۔ نہیں جانتے۔ تم لوگ صرف وقتی جذبوں
کو محبت کا نام دے کر رونا اور دواویلا مچانا جانتے ہو۔ تم سچائی کو نہیں پرکھ
سکتے۔ تمہیں کھرے کھوٹے کی تمیز نہیں۔ اور جو سچائی کو پرکھ نہیں سکتا وہ محبت
کیسے کرے گا۔ اور جو محبت کرنے کا فن نہیں جانتا وہ وفا کیا کرے گا۔ چلے جاؤ
یہاں سے۔ چلے جاؤ۔ پلیز! مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔“

عدیل بڑی دیر سر جھکائے کھڑا کچھ سوچتا رہا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد گاہ
اٹھا کر کوئل کی طرف بھی دیکھ لیتا مگر۔

وہ نگاہیں پھیرے لا تعلق سی کھڑی تھی۔ چہرے پر اس محبت، ان جذبوں
کا ہلکا سا بھی عکس نہ تھا جو اس کے لیے وہاں ہمیشہ موجود رہتے تھے۔

تب۔ مایوس ہوتے ہوئے جھکے سر کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا نیچے
اتر گیا۔ زندگی کی ہر بازی ہار کر۔

کوئل کچھ دیر ساکن کھڑی اسی جگہ کو دیکھتی رہی جہاں تھوڑی دیر پہلے عدیل

کھڑا تھا۔ پھر۔ مہری پر گری اور چھوٹ چھوٹ کر رونے لگی۔
 کہ چلے جانے والے سے اسے بے پناہ محبت تھی۔!! اس نے اپنے تمام تر
 سچے جذباتوں کے ساتھ چاہا تھا۔!!!

ختم شد

دیکھ سکتی تھی۔ خود برباد ہو سکتی تھی مگر اپنی وجہ سے کسی اپنے کو برباد ہوتا دیکھنے کی اس میں ہمت تھی نہ طاقت۔ !!

”خدا گواہ ہے کہ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ پوری طرح۔ میں نے ہر آنے والے خطرے سے تمہیں آگاہ کر دیا ہے۔ تم پھر بھی اپنی بات منوانے پر اڑے رہو تو۔ تو تمہاری مرضی۔ مجھے بہر حال تمہاری خوشی عزیز ہے۔ اپنی خوشیوں سے زیادہ تمہاری خوشی۔“

”کوئل۔! وفور مسرت سے وہ چیخ سا پڑا۔

”تم کتنی اچھی ہو۔ تم کتنی عظیم ہو۔“

اس نے اسے بازوؤں میں بھر کر چکر دے ڈالا۔ وہ تو بالکل ہی دیوانہ ہو گیا تھا۔

”میں جانتا تھا کہ تم مجھے نہیں ٹھکراؤ گی۔ تمہارا یہ احسان میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ اس کے بدلے میں میں دنیا بھر کی خوشیاں تمہارے قدموں میں لا ڈھیر کر دوں گا۔ میں تم پر سے اپنی زندگی، اپنی محبت، اپنا تن من، سب کچھ قربان کر دوں گا۔ تمہاری اک اک مسکراہٹ کے لیے میں اپنی ہستی تک مٹانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑوں گا۔ تم دیکھنا تو سہی۔“

وہ جنوبی انداز میں جانے کیا کیا کہے جا رہا تھا۔ اسے کچھ ہوش نہ تھا۔

”اب آج سے باجی واجی آپ واپ سب ختم۔ کوئی بڑاپن۔ کوئی چھوٹاپن نہیں۔ آج سے ہماری دوستی نے ایک نیا روپ دھار لیا ہے۔ آج سے تم میری صرف کوئل ہو۔ منی سی کوئل۔! عدیل کی کوئل۔!!“

مگر کوئل ان سب باتوں سے بے نیاز کسی گہری سوچ میں غرق تھی۔ وہ اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں سے بھی بے نیاز تھی۔

اور۔ عدیل کہے جا رہا تھا۔

”کوئل! صرف تین سال کی بات ہے۔ اور یہ تین سال تو پلک بھپکتے میں گزر جائیں گے۔ پھر ہم ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔ صرف تین سال پھر تم۔ میں۔ کوئل۔ عدیل۔ دونوں کی ایک راہ۔ ایک منزل۔ ہم مل کر اک نیا جہاں آباد کریں گے۔ جہاں محبتیں ہوں گی۔ چاہتیں ہوں گی۔ پیار ہوگا۔ خلوص ہوگا۔ خوشیاں ہوں گی۔ اور۔ اور۔“

اور کوئل کی آنکھوں سے ٹوٹتے بکھرتے ہوئے ایک ایک موتی میں وہ اپنی ہی شبیہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے خیال میں یہ خوشی کے آنسو تھے۔

کوئل کی آنکھ سے گرنے والا ہر موتی مقدس تسبیح کا دانہ تھا۔ چونک کر اس نے اپنا رومال آگے کر دیا۔